نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی

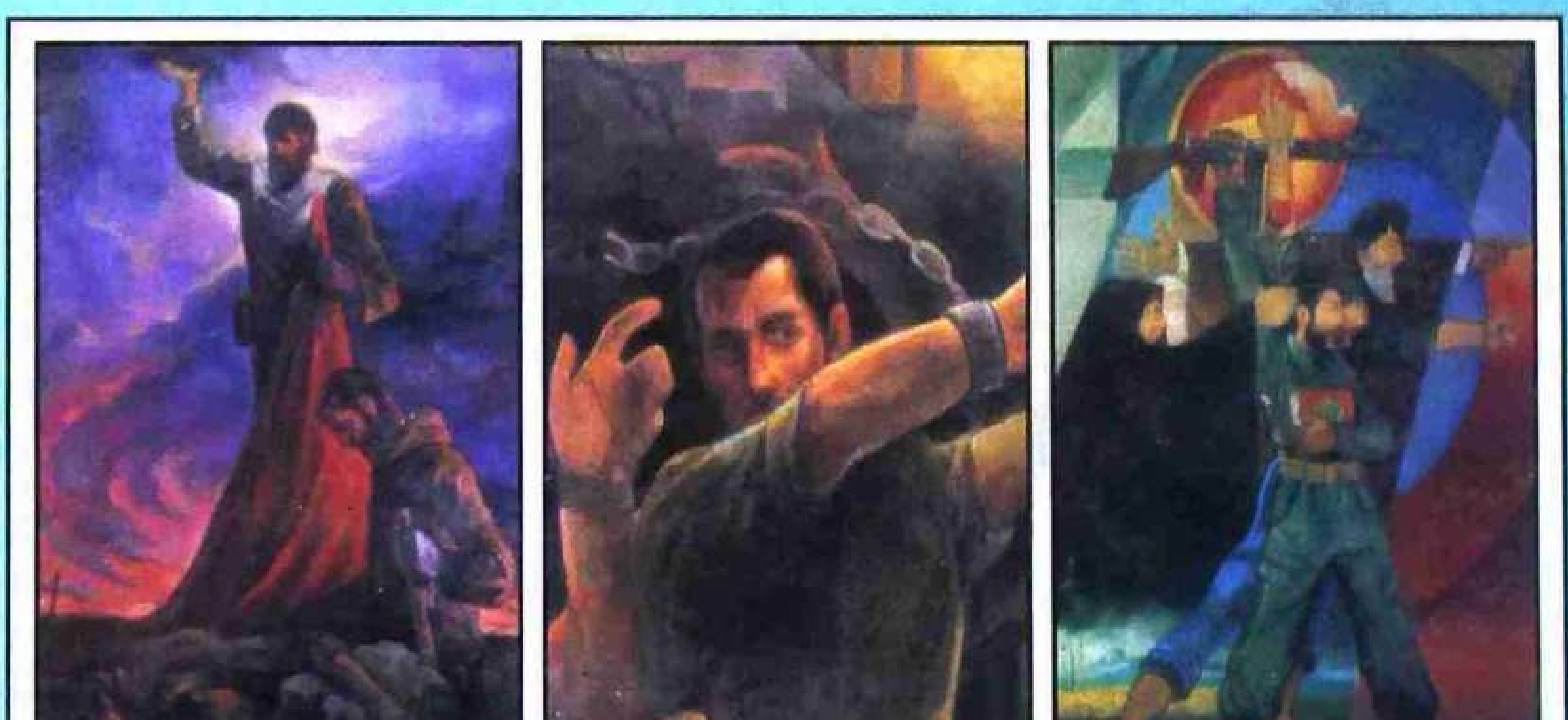

شیخ حسن موسیٰ الصفار

نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی

ACC No. 7956 Date.........
Section..................Status..........
D.D. Class..........................
NAJAFI BOOK LIBRARY

تالیف

حجت الاسلام شیخ حسن موسیٰ الصفار

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳ - کراچی ۷۴۶۰۰ - پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دار الثقلین
DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نامِ کتاب : نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی

تالیف : حجت الاسلام شیخ حسن موسیٰ الصفار

ترجمہ : سید سعید حیدر زیدی

ناشر : دار الثقلین

طبع اول : محرم ۱۴۲۲ھ، اپریل ۲۰۰۱ء

طابع : ایس، ایم، پرنٹرز

قیمت : ۴۰ روپے

فہرست

عرضِ ناشر ــــــــ ۹

ــــــــ ۱۱

حیاتِ امام علیؑ ــــ ۱۹

امامؑ کی جوانی کا دور ــــــــ ۲۱

کبر سنی کا زمانہ ــــــــ ۲۳

دورِ آخر ــــــــ ۲۴

نہج البلاغہ کیا ہے؟ ــــــــ ۲۵

نہج البلاغہ کی اہمیت ــــــــ ۲۷

نہج البلاغہ پر حملے ــــــــ ۲۸

عدالتِ اجتماعی ــــ ۳۳

عدالتِ تکوینی (کائنات میں پایا جانے والا توازن) ــــــــ ۳۵

عدالت اجتماعی ــــــــ ۳۶

معاشرے میں ظلم کی مختلف شکلیں ــــــــ ۳۸

۱: فقر و محرومی ــــــــ ۳۹

الف : طبقاتی تفریق ــــــــ ۴۱
ب : گمراہی اور جرائم ــــــــ ۴۱
ج : معاشرتی بے چینی اور بدنظمی ــــــــ ۴۲
۲ : یکساں مواقع فراہم نہ ہونا ــــــــ ۴۲
۳ : قانون کی گرفت سے محفوظ رہنا ــــــــ ۴۵
۴ : دوسروں کے حقوق کی پامالی ــــــــ ۴۷
ظلم کے مقابل ہمارا موقف کیا ہونا چاہئے ــــــــ ۴۸
☆ ظلم دیکھ کر غم اور دکھ کا احساس کرنا ــــــــ ۴۹
☆ ظالم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دینا ــــــــ ۵۰
☆ عدل کے قیام اور ظلم کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کرنا ــــــــ ۵۰

حق ــــ ۵۱

حق کا معیار کیا ہونا چاہئے ؟ ــــــــ ۵۴
حق کی کسوٹی ــــــــ ۵۹
حق اور اسکے پیروکاروں کی تلاش ــــــــ ۶۱
حق کے حوالے سے ہماری ذمے داری ــــــــ ۶۴

آزادی ــــ ۶۷

کائنات کی عبودیت ــــــــ ۶۸
انسان کی آزادی ــــــــ ۷۰
تفکر اور سوچ سمجھ وہاں موثر ہے جہاں اختیار حاصل ہو ــــــــ ۷۲
قضاوقدر ــــــــ ۷۳
وراثت اور تربیت ــــــــ ۷۵

آزادی کے مظاہر ـــــــــــ ۷۶
۱: فکر اور عقیدے کی آزادی ـــــــــــ ۷۷
۲: بیان اور تنقید کی آزادی ـــــــــــ ۷۸
۳: کردار و عمل کی آزادی ـــــــــــ ۸۰
پھر یہ پابندیاں اور سزائیں کیوں ہیں؟ ـــــــــــ ۸۱
انسان کس طرح غلام بنتا ہے ـــــــــــ ۸۳
۱: غرائز اور دنیوی خواہشات ـــــــــــ ۸۳
۲: اندھی تقلید ـــــــــــ ۸۴
۳: دوسروں کا تسلط اور انکی طاقت ـــــــــــ ۸۵

معاشرتی ذمے داری ـــــ ۸۹

امت اسلامیہ کی افسوسناک صورتحال ـــــــــــ ۹۰
۱: بے تعلقی ـــــــــــ ۹۱
۲: منفی طرزِ عمل ـــــــــــ ۹۳
۳: ذمے داری قبول کرنا ـــــــــــ ۹۴
اب چارۂ کار کیا ہے؟ ـــــــــــ ۱۰۱
خلاصۂ کلام ـــــــــــ ۱۰۵

جہاد ـــــ ۱۰۷

جہاد کی اہمیت ـــــــــــ ۱۰۹
حیرت انگیز بات ـــــــــــ ۱۱۳
نفسانی برائیوں کے خلاف جہاد (جہادِ اکبر) ـــــــــــ ۱۱۴
بری اقدار ـــــــــــ ۱۱۶

۱: دنیوی زندگی اور آرام طلبی سے لگاؤ ———— ۱۱۶
۲: دین اور زندگی کے بارے میں ایک فکری مغالطہ ———— ۱۱۹
۳: عذر بدتر از گناہ ———— ۱۲۳
۴: زبانی کلامی انقلابی بننا ———— ۱۲۵
کس ذریعے سے اور کس مقصد کے لئے جہاد کیا جائے ———— ۱۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

سیاسی اور اجتماعی امور میں امت کی رہبری اور رہنمائی امام کی ایک اہم ذمے داری ہے۔ ائمہء معصومینؑ میں دوسرے ائمہؑ کی بہ نسبت امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو سیاسی اور اجتماعی امور میں زیادہ اور علانیہ فعالیت کا موقع نصیب ہوا۔ گو باقی ائمہؑ بھی ان امور سے لاتعلق نہ رہے اور حالاتِ زمانہ اور سیاسی فضا کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ ہوئے لیکن اس سلسلے میں سرگرم کردار کی ادائیگی کے سب سے زیادہ مواقع امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو حاصل رہے اور آپؑ نے بہت زیادہ فعالیت کا مظاہرہ کیا۔ بالخصوص اپنی خلافت کے زمانے میں مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی تطہیر اور از سرِ نو تعمیر کے دوران تقریباً تمام ہی اجتماعی میدانوں کے لئے آپؑ نے ہدایات دیں، پالیسیاں بیان فرمائیں، ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت فرمائی اور ان کے نفاذ کے سلسلے میں جانفشانی کی حد تک جد وجہد کی۔ نہج البلاغہ کے اکثر خطبات اور مکتوبات انہی امور کے متعلق امامؑ کی گفتگو پر مشتمل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب حجت الاسلام شیخ حسن موسیٰ الصفار کے ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جن میں انہوں نے نہج البلاغہ میں موجود خطبات، مکتوبات اور حکیمانہ کلمات کے ذریعے حیاتِ

اجتماعی کے مختلف شعبوں کے بارے میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے موقف اور تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اصل کتاب عربی میں تالیف کی گئی ایران میں اس کا فارسی ترجمہ شائع ہوا اور اب اس فارسی ترجمے سے کیا گیا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لیکچرز کیونکہ جوانوں کے روبرو دیئے گئے تھے اس لئے ان میں اختصار اور آسانی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ امید ہے یہ تالیف نسلِ نو کے لئے اسلام کی اجتماعی تعلیمات کو سمجھنے اور خود کو معاشرے اور اجتماع کے حوالے سے اپنے فریضے کی ادائیگی کے لئے تیار کرنے کی راہ میں ایک قدم ثابت ہوگی۔

آخر میں ہم ان تمام مومن بھائیوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کی طباعت کے مختلف مراحل میں ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ اپنے قارئین کے تبصروں، آراء اور تجاویز کا ہمیں انتظار رہے گا۔

والسلام

سیکریٹری نشرواشاعت

دارالثقلین

مقدمہ

دنیا میں ۸۰ ملین مسلمان بستے ہیں(۱)' کرہَ عرض کے ایک بڑے حصے پر اہلِ اسلام کو اقتدار و اختیار حاصل ہے' اسلامی ممالک جغرافیائی لحاظ سے دنیا کے اہم ترین خطوں میں واقع ہیں' جیسے ایشیا' افریقہ اور یورپ کا ایک بڑا حصہ 'اسٹرے ٹجک لحاظ سے اکثر اہم ترین سمندروں' جیسے بحرَ ہند' بحرَ اطلس' بحرَ احمر اور میڈیٹرین سی پر انہیں غلبہ و تسلط حاصل ہے اور اکثر اسٹرے ٹجک راستوں اور تنگناؤں پر ان کی حکمرانی ہے' جیسے نہر سوئز' اور تنگنائے ہرمز وغیرہ۔

بعض اسلامی ممالک تیل کی بر آمد کے لحاظ سے ان ممالک میں سے ہیں جو دنیا کو سب سے زیادہ تیل بر آمد کرتے ہیں۔ دنیا کے تیل کے ۶۰ فی صد سے زیادہ ذخائر اسلامی ممالک کے پاس ہیں۔ دنیا بھر میں پائی جانے والی فاسفیٹ کے ایک تہائی ذخائر اور تانبے' لوہے اور میگنیزیم (Magnezim) کے بڑے بڑے ذخائر بھی مسلم ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح انتہائی زرخیز زمینیں بھی مسلم ممالک کے پاس ہیں۔

ایک طرف تو صورتحال یہ ہے' لیکن دوسری طرف بہت سے مسلمان علاقے' جیسے

---

۱ - کتاب ہذا اب سے تقریبا پچیس برس قبل تحریر کی گئی' للذا مولف نے اس وقت موجود مسلمانوں کی تعداد تحریر کی ہے' اب بحمد اللہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی آبادی ایک ارب سے زیادہ ہے۔

فلسطین، صحرائے سینا، جولان کی پہاڑیاں، اریٹریا، فلپائن اور ترکستان استعماری اور قابض اقوام کے پنجوں میں ہیں۔ بڑی طاقتوں اور استعماری ممالک نے تمام دنیا اور اسلامی ممالک کو بھی مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے درمیان تقسیم کر رکھا ہے اور ان پر تسلط اور اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے بھی خود کو ان طاقتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے، کسی بھی میدان میں ان کے پاس کچھ بھی نہیں، حتیٰ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی خود کفیل نہیں۔ اسلامی ممالک اسلحہ، کپڑا، مشینری، آلات، کھانے پینے کی اشیاء، حتیٰ جوتے، نیل کٹر اور ٹشو پیپر تک بیرون ملک سے درآمد کرتے ہیں۔

امت اسلامیہ کے عظیم الشان مال و دولت کا مالک ہونے کے باوجود، حال یہ ہے کہ اکثر اسلامی ممالک کے عوام غربت و افلاس اور محرومیت اور بے سروسامانی کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ اسلامی ممالک جو تیل کی بیش بہا دولت سے مالا مال ہیں، وہاں بھی بہت سے گھرانے چھپروں اور جھونپڑوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔

امت اسلامی سادہ ترین علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں اور لوگوں کی بنیادی ترین ضروریات جیسے آب رسانی، زراعت، ڈیری فارمنگ وغیرہ کے سلسلے میں بھی غیروں کی محتاج ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے اکثر ذہین افراد اور سائنس و ٹیکنالوجی کے ماہرین سے غیر مستفید ہو رہے ہیں۔

امت اسلامیہ کی صورت حال کی ان دو باہم متضاد تصویروں کو دیکھنے والا ہر باشعور اور دردمند فرد، حیرت و استعجاب میں ڈوب جاتا ہے، اس صورتحال پر کڑھتا اور روتا ہے، اور پھر اس صورتحال کو وجود میں لانے والے اسباب و عوامل کو تلاش کرتا ہے اور بے شک اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ امت کی ذلت، زبونی اور پسماندگی کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ خداداد نعمتوں سے محروم ہے، اسکے پاس زیر زمین خزانوں کی کمی ہے۔ کیونکہ ہم خود اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے ممالک، اپنے محدود وسائل اور سادہ قوتوں کے

ساتھ ایک بہتر سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور انتہائی ترقی اور پیشرفت کے حامل ہیں، جیسے جاپان۔

پس امتِ اسلامیہ کو جس دردناک پسماندگی نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، اسکی حقیقی وجہ کچھ اور ہے، اور وہ ہے ایک متعین اور واضح پروگرام کی جانب توجہ کا نہ ہونا۔ لہٰذا نہ وہ اپنے کردار سے واقف ہیں، نہ اپنے پاس موجود وسائل وامکانات کی اہمیت اور قدروقیمت سے باخبر ہیں اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ ان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے۔

بالفاظ دیگر اس دور میں مسلمانوں کی حالت ایک ایسے بچے کی سی ہے جس کا باپ کثیر مال و دولت اس کے لئے چھوڑ کر انتقال کر گیا ہو۔ اور وہ بچہ اپنی کم سنی کی بنا پر یہ نہ جانتا ہو کہ اس دولت کو کیسے اپنے تصرف میں لائے، کس طرح اس سے استفادہ کرے؟ اور کس طرح اپنے روشن کل اور کامیاب زندگی کے لئے اسے استعمال کرے؟

نتیجے کے طور پر یہ کثیر مال ودولت غلط استعمال اور فضول خرچی کی وجہ سے برباد اور ختم ہونے لگتا ہے اور آخر کار وہ بچہ فقرو ناداری کا شکار ہو کر اپنی عزت اور مقام سے محروم ہو جاتا ہے۔

درحقیقت ہر قوم کو ایک خاص طرزِ فکر اور مخصوص پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ اسکی روشنی میں اپنی زندگی کا راستہ طے کر سکے۔ ایسی قوم جو اپنی زندگی کے لئے کسی واضح لائحہ عمل کی مالک نہ ہو، وہ جہالت اور نادانی کے گڑھے میں ہاتھ پاؤں مارتی رہ جاتی ہے۔

متعین طرزِ فکر اور لائحہ عمل کے لئے ضروری ہے کہ حقائقِ کائنات اور اس قوم کی تاریخ ان کا سرچشمہ ہوں، تاکہ ان میں باہمی یگانگت پائی جائے اور قوم اپنی توانائیوں کو ابھار سکے اور خداداد نعمتوں کو اپنی ترقی اور پیش رفت کے لئے استعمال کر سکے۔

اس کے برعکس اگر کوئی قوم اپنا طرزِ فکر اور لائحہ عمل ایسے معاشروں سے حاصل کرے جو حقائقِ کائنات، امکانات و وسائل اور اس قوم کی تاریخ سے بے گانے ہوں اور اس قوم سے بنیادی فرق رکھتے ہوں، تو ایسی صورت میں اس قوم کو بکثرت خطرات

اور مشکلات کا خدشہ لاحق رہے گا۔

ایک ایسا شخص جس نے اپنی آنکھوں پر اپنے نمبر کی عینک نہ لگائی ہوئی ہو' اسے کن مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا؟ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں' ہر صاحب فہم اسکا تصور کر سکتا ہے۔ سادہ طور پر عرض کر دیں کہ وہ اپنے سامنے رکھی ہوئی چیزوں کو بھی صحیح طور پر نہ دیکھ سکے گا' وہ چیزوں کو الٹا' یا ان کے اپنے حجم سے بڑا یا چھوٹا دیکھے گا' اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ایک کے دو یا اس سے بھی زیادہ نظر آئیں۔ اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اسکے اپنی رہی سہی بینائی سے محروم ہو جانے کا خطرہ بھی موجود ہے۔

کیا ہم نے کچھ غلط کہا ہے؟

ایک ایسی قوم جو اپنے اصل و اصول سے مختلف در آمدی (Imported) نظریات' پروگراموں اور اجنبی تہذیب و تمدن کو اپنے معاشرے میں لاگو کرے گی اسے لازماً مذکورہ بالا نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ زندگی کے بارے میں اسکے تصورات وافکار اضطراب اور تشویش کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ صورتحال نہ صرف یہ کہ قوم کو بہت جلد پسماندگی اور ذلت وخواری سے دو چار کردے گی بلکہ اسمیں موجود تمام اچھی قدروں اور مثبت صلاحیتوں کی بربادی پر منتج ہوگی۔

یہ وہی صورتحال ہے جس کا آج امت اسلامی کو سامنا ہے اور جو اسکی پسماندگی اور زبوں حالی کا بنیادی سبب ہے۔

البتہ اب جبکہ امت اسلامیہ کی نسلِ نو خوابِ گراں سے بیدار ہو چکی ہے' اسے ہوش آچکا ہے' اپنی پسماندگی اور اپنے تاریک مستقبل کو محسوس کر رہی ہے اور دوسری اقوام کی قابلِ تحسین ترقی اور پیشرفت بھی جس کے سامنے ہے' اور جو اپنے قدموں میں پڑے قدرتی وسائل اور زیرِ زمین ذخائر سے بھی آگاہ ہے' تو ایسے میں ان بیش بہا خزانوں اور کثیر سرمایوں سے صحیح صحیح استفادے کے لئے ایک عملی پروگرام اور لائحہ عمل کی ضرورت واضح ہے۔ تاکہ یہ امت بھی اپنی اس پسماندگی سے نجات حاصل کرے اور

تمدن ‘ٹیکنالوجی ‘سائنس اور صنعت کے رواں دواں کارواں میں شامل ہو جائے۔

ظاہر بات ہے کہ استعماری ممالک اور بڑی طاقتوں کو یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ ترقی پذیر ممالک ہوش میں آئیں اور ترقی و کمال کے راستے تلاش کریں۔ بلکہ وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اس بات کے لئے سرگرم ہوں گی کہ ان ممالک کی ترقی کا پہیہ جام کر دیں اور ان کے راستے میں کانٹے بو دیں‘ تاکہ یہ اقوام ہمیشہ ان کی ناجائز خواہشات اور احکامات کے آگے سرِ تسلیم خم اور ان کے مشیروں اور ماہرین کی محتاج رہیں۔ اس مقصد کے لئے استعمار خود کو حاصل بے حد و حساب مواقع سے خوب اچھی طرح فائدہ اٹھاتا ہے۔

اب جبکہ اس امت کے فرزند ‘زندگی کے لئے ایک نظریے اور لائحہ عمل کی تلاش میں ہیں ‘ایک ایسے نظریے اور پروگرام کی جستجو میں ہیں جو امت کے روشن مستقبل کی ضمانت بن سکے ‘تو استعمار اس موقع کو کیوں نہ غنیمت سمجھے اور کیوں نہ اس نئی نسل کے سامنے ایک ایسا نظام اور پروگرام پیش کرے جو اسکی استعماری خواہشات کو پورا کرتے ہوئے ہماری نئی نسل کے مستقبل کو اسکے ہاتھوں میں دیدے اور وہ اس ذریعے سے اپنے مطلب کے لوگ اور اپنے پٹھو تیار کرے؟

یہ کوئی خیالی بات نہیں ‘بلکہ عملاً ایسا ہو تا رہا ہے۔ برسوں سے ہم اس بات کا مشاہدہ کر رہے ہیں کہ یہ بین الاقوامی لٹیرے ‘پروپیگنڈے کے کثیر اور وسیع ذرائع کے ذریعے ‘ اپنی علمی اور فنی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے دوران اور دیگر گمراہ کن اور فریبی راستوں سے ہماری نسلِ نو کے سامنے زندگی گزارنے کے ایسے نظریے اور پروگرام پیش کرتے ہیں جو ہماری قوم کی اصل و اصول سے متصادم ہیں اور کائنات کی حقیقتوں اور ہماری اقدار سے کسی طرح بھی سازگار نہیں ہیں اور جو قوم میں فکری تشویش اور اضطراب کا سبب ہوتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ امت کی نئی نسل کیوں دوسروں کے افکار اور نظریہ ہائے حیات قبول کرنے پر خود کو مجبور پاتی ہے؟

کیا امتِ اسلامی کے پاس زندگی کا کوئی دستور اور تمدن کا اپنا کوئی خاکہ نہیں؟

یا اس حوالے سے کوئی اور مسئلہ درپیش ہے؟

درحقیقت 'امتِ اسلامی تاریخِ بشریت کے بہترین قانون اور عظیم الشان میراث یعنی اسلامی قانون و میراث کی مالک ہے' جو زندگی کے تمام شعبوں کے لئے مناسب ترین اور جامع ترین پروگراموں کا حامل ہے۔ اور یہ قانون اپنی جامعیت اور بشریت کی تمام ضروریات کا احاطہ کرسکنے کی اپنی صلاحیت سے انسانیت کو حیرت و استعجاب سے دوچار کر سکتا ہے۔ اور اگر ہم اس عظیم الشان میراث کے تمام حصوں کا علمی جائزہ لیں تو اس کے اندر زندگی کے تمام میدانوں کے لئے معقول اور پسندیدہ پروگراموں کا مشاہدہ کریں گے۔

اس عظیم میراث سے تعلق رکھنے والی صرف ایک کتاب "وسائل الشیعہ" کا مطالعہ کریں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں :

- ۴۰۸۲ 'احادیث' صرف میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں ہیں۔
- ۲۴۲۹ 'احادیث' کھانے پینے کے آداب کے بارے میں ہیں۔
- ۴۶۴ 'احادیث' صفائی اور پاکیزگی کے بارے میں ہیں۔
- ۸۲ 'احادیث' دانتوں کی صفائی اور انہیں مسواک کرنے کے بارے میں ہیں۔

البتہ اس عظیم میراث کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے' جن کی وجہ سے یہ دورِ جدید کے تقاضوں کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ یہاں تک کہ نسلِ نو اس نعمت کی موجودگی اور اس کی قدر و قیمت تک نہیں جانتی۔ یہ مشکلات درج ذیل ہیں۔

۱ : یہ اسلامی میراث اپنی ساخت اور اسلوب کے لحاظ سے اس زمانے سے متاثر ہے جس میں یہ ظاہر ہوئی اور جس ابتدائی دور میں اسکی تبلیغ ہوئی۔ لہٰذا یہ ہر دور کے لحاظ سے اپنی ساخت اور اسلوب میں تجدید کی محتاج ہے' تاکہ ہر زمانے سے ہم آہنگ ہو سکے' اور اس تجدید کے لئے کوئی کوشش ہمیں اپنے دور میں نظر نہیں آتی (۱)۔

---

۱ - خوش قسمتی سے عصرِ حاضر میں امام خمینیؒ کی رہنمائی میں بپا ہونے والے اسلامی انقلاب کے بعد سے یہ مسئلہ بھی حل ہوا ہے اور دین اپنی زندہ اور حیات آفرین صورت میں سامنے آیا ہے۔

۲ : اس میراث کی تبلیغ اور تشہیر بھی خاطر خواہ پیمانے پر نہیں ہو رہی۔

۳ : افسوس کہ بعض مسلکی تعصّبات ، سیاسی رجحانات ، اور فکری جمود بھی اس عظیم میراث سے استفادے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

ان حالات میں نسلِ نو فکری خلا سے دوچار اور خود کو غیروں کے نظریات اور افکار کی محتاج محسوس کرتی ہے ، اور یوں استعمار کو اس فکری خلا سے فائدہ اٹھانے اور ہماری عقول واذہان کو اپنے غلیظ افکار سے بھرنے کا موقع ملتا ہے ، تاکہ جب ہم اپنی اصل اور بنیاد اور اپنی اسلامی میراث کی جانب پلٹنے کا ارادہ کریں اور اس بارے میں علمی بحث و تحقیق کرنا چاہیں تو ، مغرب کی یہ فکری اور نظریاتی یلغار رکاوٹ بنے۔

مزید برآں مغرب مختلف حربوں اور سازشوں سے ہمیں اس عظیم الشان میراث سے اپنی زندگی کے لئے دستورِ عمل اور پروگرام اخذ کرنے کا موقع نہیں دیتا۔

اسلام کی ابتدائی میراث سے تعلق رکھنے والی ایک کتاب "نہج البلاغہ" ہمارے پاس موجود ہے ، جو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب ؑ کے دل نشین اور فکر انگیز خطبات ، مکتوبات اور مختصر حکیمانہ کلمات کا مجموعہ ہے۔ گو کہ علما ، دانشوروں ، مورخین اور شارحین نے اس کتاب کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اس پر قابلِ قدر علمی کام ہوئے ہیں ، لیکن اس کے باوجود اب بھی اس کتاب کی روشنی میں ایسے موضوعات پر تحقیقی کام کی ضرورت باقی ہے ، جن کے ذریعے حیاتِ اجتماعی کے مختلف گوشوں کے لئے جامع اور کامل خاکے حاصل کئے جاسکیں اور ان کے ذریعے اس خطرناک فکری خلا کو پر کیا جاسکے جس سے ہماری نسلیں دوچار ہیں اور اس طرح ترقی اور استحکام کی جانب اس امت کی رہنمائی اور اس راہ پر اسکے سفر کا امکان پیدا ہو سکے۔

یہ کتاب ، جس کے یہ ابتدائی صفحات آپ کے زیرِ مطالعہ ہیں ، نہج البلاغہ کے تعلق سے ان خطبات اور لیکچرز کا مجموعہ ہے جنہیں ہم نے موضوعاتی اسلوب اختیار کرتے ہوئے ۱۹۷۸ء کی تعطیلات میں نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ روشن فکر افراد کے سامنے

پیش کیا تھا۔ امید ہے ہمیں اس سلسلے کو جاری رکھنے کی توفیق نصیب ہوگی' تاکہ اسلامی مسائل کے بارے میں سوچ بچار کرنے والے دیگر افراد اس قسم کی بحثوں کو پھیلانے کے لئے آگے بڑھنے کی ہمت کریں۔

واللہ ولی التوفیق

حسن موسیٰ الصفار

جزیرۃ العرب۔ قطیف

نہج البلاغہ کی روشنی میں

حیاتِ امام علیؑ

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا :

"ایھا الناس انی قد بثثت لکم المواعظ التی وعظ الانبیاء بھا اممھم وادیت الیکم ماادت الاوصیاء الی من بعد ھم، وادبتکم بسوطی فلم تستقیموا وحدوتکم بالزواجر فلم تستوسقوا للّٰہ انتم : اتتوقعون اماما غیری یطابکم الطریق ویرشدکم السبیل؟"

"اے لوگو! میں نے تمہارے لئے وہ تمام نصائح پیش کر دی ہیں جو انبیاء نے اپنی امتوں کے سامنے پیش کی تھیں اور تم تک ان تمام ہدایتوں کو پہنچا دیا ہے جو اوصیا نے بعد والوں کے حوالے کی تھیں۔ میں نے اپنے تازیانے سے تمہیں تنبیہ کی لیکن تم سیدھے نہ ہوئے اور تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے ہنکانا چاہا لیکن تم متحد نہ ہوئے۔ اللہ ہی تمہیں سمجھے! کیا میرے علاوہ کسی اور امام کا انتظار کر رہے ہو، جو تمہیں سیدھے راستے پر چلائے گا اور راہ حق کی جانب تمہاری راہنمائی کرے گا؟"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۸۰)

اصل موضوع (نہج البلاغہ اور حیات اجتماعی) پر گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی حیات مبارک پر ایک سرسری نگاہ ڈال لی جائے۔ نیز نہج البلاغہ کے اہم ترین موضوعات کا بھی مختصر جائزہ لے لیا جائے۔

ہم حضرت علیؑ کی تاریخی زندگی مثلاً آپؑ کی ولادت، میدان جنگ میں آپؑ کے کارناموں، آپؑ کے معجزات، آپؑ کے فضائل اور آپؑ کی پر افتخار شہادت کے بارے میں بارہا سنا کرتے ہیں۔ اسکے باوجود اب بھی بہت سی باتیں رہتی ہیں اور ہم نے حضرتؑ کی زندگی کے دوسرے گوشوں پر بہت کم سنا ہے۔ مثلاً اپنے حق کے حصول کے لئے آپؑ کی جد و جہد اور آپؑ کی زندگی میں آپ کا انسانی کردار وغیرہ جیسے موضوعات۔

کیونکہ امامؑ بھی ایک زمانے میں جوان تھے اور آپؑ پر بھی ادھیڑ عمری اور بڑھاپے کے ادوار گزرے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھیں گے کہ آپؑ کی زندگی کے ان مختلف ادوار میں وہ کونسی چیزیں ہیں جو تاسی اور تقلید کے لئے ایک ممتاز نمونے کے طور پر نظر آتی ہیں تاکہ ہم ان کی پیروی کر سکیں۔

امامؑ کی جوانی کا دور

دورِ جوانی، جو امیر المومنینؑ کی حیات کا اہم ترین اور حساس ترین دور تھا، اس دور میں بھی آپؑ میں ممتاز اور نمایاں خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ مثلاً آپؑ کھلے ذہن کے مالک تھے۔ یعنی آپؑ میں حق و حقیقت اور جدید افکار و نظریات قبول کرنے کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ اسی طرح آپؑ معاشرے کی غلط رسوم و رواج، اندھی تقلید حتیٰ اپنے گردوپیش موجود افراد کے رجحانات کے برخلاف اسلام پر عمل اور اسکی پیروی کے معاملے میں بھی شدید تھے۔ آپؑ کی سوچ یہ تھی کہ اگر کوئی نئی فکر اور نظریہ درست ہو تو اس سے وابستگی اور اسکے قیام و رواج کے لئے جد و جہد واجب ہے۔ آپؑ کی اس صفت کا مشاہدہ ہم رسول کریمؐ کی جانب سے دعوت کی ابتدا ہی میں آپؑ کی طرف سے اسکی

قبولیت اور اسلام کی تبلیغ و ترویج کے سلسلے میں آپؑ کی جد وجہد اور سعی و کوشش میں کرتے ہیں۔ لہٰذا جب کسی نے آپؑ سے سوال کیا کہ : اے علیؑ! دینِ اسلام قبول کرنے سے پہلے، کیا آپؑ نے اپنے والد سے مشورہ کر لیا تھا؟ تو آپؑ نے جواب میں فرمایا : جس وقت خداوند متعال نے مجھے خلق کیا تو کیا اس نے میرے والد سے مشورہ کیا تھا، جو میں اللہ رب العزت کی عبودیت اختیار کرنے کے بارے میں ان سے مشورہ کرتا۔

حضرت علیؑ کی ایک اور صفت، بلند ہمتی اور جوانمردی تھی۔ ایامِ جوانی میں آپؑ کی سوچ کا مرکز و محور محض اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر نہ تھا۔ آج کے اکثر جوانوں کی طرح آپؑ صرف اپنی تعلیم کی تکمیل، فارغ التحصیل ہونے کے بعد اچھی ملازمت اور عہدے کے حصول، خوبصورت شریک حیات اور پر تعیش رہائش ہی کے بارے میں سوچا نہ کرتے تھے۔ بلکہ آپؑ امت کے روشن مستقبل کے بارے میں سوچتے تھے اور آپؑ کی تمام تر وابستگی اسلام کے ساتھ تھی۔

آپؑ کی فکر ذاتی خواہشات اور شخصی آرزوؤں سے بلند تر تھی، آپؑ رسول کریمؐ کے بعد عالمِ خلقت کی دوسری بڑی شخصیت ہونے کے ناتے عالمِ انسانیت کی سعادت اور کامیابی کی سمت رہنمائی کے سلسلے میں فکر مند اور کوشاں رہا کرتے تھے۔

اسی ابتدائی مرحلے میں، جبکہ رسول مقبولؐ نے خدا کے حکم : وانذر عشیر تک الاقربین (اور اپنے قریبی عزیزوں کو ڈرایئے۔ سورہ شعراء ۲۶۔ آیت ۲۱۴) کی تعمیل میں اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کیا اور اس اجتماع میں اپنے اعزہ و اقربا کے سامنے اپنی دعوت کے مقاصد پیش کئے اور رسالت کی بھاری ذمے داریوں میں شریکِ کار ہونے کے لئے ان سے مدد و نصرت طلب کی اور فرمایا کہ کارِ رسالت میں میرا مددگار اور معاون فرد ہی میرے بعد میرا جانشین اور وصی ہو گا۔ اس موقع پر سب سے پہلے حضرت علیؑ ہی اپنی جگہ سے اٹھے اور اٹل لہجے میں فرمایا : اے اللہ کے رسولؐ! میں آپ کا ناصر و مددگار ہوں۔

عمر کے اس حصے میں "خوداعتمادی" بھی حضرت علیؑ کی ایک منفرد صفت تھی۔ باوجود یہ کہ آپؑ کم سن تھے اور ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے جہاں عمر اور جسمانی طاقت کو معیارِ فضیلت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ نے ان رسوم و روایات اور زمانہء جاہلیت کے معیارات سے ماوراء قدم اٹھایا اور جسمانی طاقت اور عمر رسیدگی جیسے معیاروں کو ایک طرف رکھتے ہوئے خدا پر بھروسے اور اپنی خوداعتمادی کے بل بوتے پر خطرناک ترین حوادث کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور مشکل ترین حالات میں اپنی کامیابی کے پرچم نصب کئے۔ اسکی ایک مثال "جنگ خندق" ہے۔ جب جنگجو اور دیو پیکر پہلوان "عمرو بن عبدود" نے میدان میں اتر کر مسلمانوں کو للکارا تو لشکرِ اسلام پر سناٹا طاری ہو گیا سب وحشت زدہ ہو کر دم سادھے بیٹھے تھے، کوئی نہ تھا جو اسکی للکار کا جواب دیتا۔ اس موقع پر رسول اللہؐ کی آواز بلند ہوئی : تم میں ہے کوئی جو "عمرو" کے مقابلے پر آئے؟ یہ سن کر حضرت علی ابن ابی طالبؑ کھڑے ہوئے اور کہا : اے اللہ کے رسولؐ! میں اس کا مقابلہ کروں گا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا : علی! جانتے ہو کس سے مقابلے کی بات کر رہے ہو، یہ "عمرو" ہے!!؟ آپؑ نے جواب دیا : ہاں! اللہ کے رسولؐ، میں اسے جانتا ہوں، اور میں بھی "علی" ہوں۔

کبر سنی کا زمانہ

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد امت مسلمہ کے درمیان وجود میں آنے والی ایک انحرافی لہر کے خلاف آپؑ نے نہایت دانشمندانہ انداز سے قائدانہ کردار ادا کیا۔ آپؑ کا یہ کردار آخر کار آپؑ کی دینی اور شرعی قیادت پر منتج ہوا جس کے لئے خداوند عالم نے آپؑ کو منتخب کیا تھا۔

جس موقع پر آپؑ نے اپنے حق کے حصول کے لئے مخالفین سے ٹکراؤ اور جنگ و جدال کو اسلام، مسلمانوں اور رسول کریمؐ کی تحریک کے مفاد میں محسوس نہ کیا اس موقع پر آپؑ نے اپنے مسلمہ حق سے چشم پوشی کی، لیکن وہاں بھی آپؑ نے حالات کے سامنے

گھٹنے نہیں ٹیک دیئے تھے اور خانہ نشین ہو کے نہیں رہ گئے تھے، آپؑ نے ایک تماش بین کی حیثیت سے حالات کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس دور کے بالادست طبقات کے خلاف ایک حکیمانہ طرز عمل اپنایا اور مواقع سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی عقائد اور صحیح اسلامی اصولوں کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے۔ اس دور میں آپؑ نے اسلام سے مخلصانہ وابستگی رکھنے والے ایک گروہ کی تربیت کی، جو بگاڑ اور باطل کے خلاف ایک عوامی تحریک اور انقلاب کا باعث بنا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ جیسے اصحاب، جنہوں نے اموی استبداد کے خلاف کلمہ ء حق بلند کیا، حضرت عمار یاسرؓ جنہوں نے امیر المومنین حضرت علیؑ کی حکومت کے قیام کے سلسلے میں نہایت فعال اور سرگرم کردار ادا کیا، اسی طرح محمد ابن ابی بکرؓ، مالک اشترؓ اور ہاشم مرقالؓ جیسے جلیل القدر افراد اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

دورِ آخر

اب جبکہ آپؑ کے جسمِ مبارک پر پیرانہ سالی اپنے اثرات جما چکی تھی، تغیراتِ زمانہ اور مختلف حوادث کے بعد حکومتِ اسلامی کی باگ ڈور آپؑ کے سپرد کی گئی۔ اپنے انتہائی مختصر دورِ حکومت میں آپؑ نے ایک اسلامی حکمران کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، اسلامی احکام کے اجراء و نفاذ میں کسی طرح کی تاخیر کو روا نہ سمجھا اور تمام تر مشکلات اور دشوار حالات کے باوجود دنیا کے سامنے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی بے عیب تصویر پیش کر دی۔

آپؑ اپنی حکومت کے استحکام اور بقا کے لئے کسی قسم کی غیر اصولی سیاست پر رضامند نہ ہوئے۔ لہٰذا جب آپؑ کو طلحہ و زبیر اور معاویہ ابن ابی سفیان سے مصالحت (Accommodate) کرنے کا مشورہ دیا گیا تو آپؑ نے سختی کے ساتھ اس مشورے کو مسترد کر دیا۔

آپؑ نے معاشرتی عدل و انصاف کی خوبصورت ترین تصویر پیش کی اور اپنے دورِ

اقتدار میں اپنے اقربا میں سے کسی کو بھی دوسروں پر ناحق ترجیح نہ دی اور حقوق کے مسئلے میں اپنے دوست احباب، حتیٰ بھائی سے بھی کوئی رو رعایت نہ برتی۔

نہج البلاغہ کیا ہے؟

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا۔ اب ہم نہج البلاغہ کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

علیؑ صرف ایک حکمراں نہ تھے، جو احکام و فرامین صادر کرتے ہیں، لوگوں پر اپنا حکم مسلط کرتے ہیں اور لوگوں کا کام بلاچوں وچرا ان کی اطاعت ہوتا ہے۔ بلکہ آپؑ خدا اور پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے تفویض کردہ ایک ذمے داری کے حامل تھے، اور یہ ذمے داری الٰہی پیغام کی نشرواشاعت اور اسکا نفاذ تھی۔

لوگوں کو بیدار کرنے اور اسلامی پیغام کی تشریح و توضیح کے لئے آپؑ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ لہٰذا اسلام کے تقاضوں کی جانب لوگوں کو متوجہ کرنے کے سلسلے میں آپؑ نے بہت زیادہ جد و جہد کی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے آپؑ نے تعلیم و تربیت کے ذرائع اور خطبات و نصائح سے استفادہ کیا۔

ہمارے علم میں نہیں کہ لوگوں کی ہدایت اور امت اسلامی کی رہنمائی کے لئے حضرت علیؑ کی مانند کسی اور حکمراں نے اس قدر وسیع فکری میراث چھوڑی ہو۔ جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے بعد جن حکمرانوں نے مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی انہوں نے آپؑ کی اس فکری میراث اور اس کی نشرو اشاعت کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، لیکن ان لوگوں کی خواہشات اور اقدامات کے برخلاف خوش قسمتی سے اس عظیم میراث کا ایک بڑا حصہ محفوظ رہا اور مختلف صورتوں میں امتِ اسلامی کی بعد کی نسلوں تک پہنچا۔

سن چار سو ہجری میں سید رضی علیہ الرحمہ نے اس عظیم الشان علمی میراث کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا۔ البتہ کیونکہ سید رضی کے پیش نظر مولاؑ کے کلام کا صرف ادبی پہلو

تھا لہٰذا انہوں نے صرف اسی نکتہ ء نظر سے امامؑ کے کلام کو جمع کیا اور صرف اس کلام کا انتخاب کیا جس میں بلاغت اور ادب کا پہلو نمایاں تھا۔ اگرچہ مولاؑ کی یہ علمی میراث دوسرے پہلوؤں سے بھی بے انتہا اور اعلیٰ قدر و قیمت کی حامل ہے لیکن سید رضی نے اس سے صرفِ نظر کیا۔ خود انہوں نے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے نہج البلاغہ کے مقدمے میں تحریر کیا ہے کہ : ہم نے یہاں مولاؑ کے کلام میں سے غیر منظّم فصلوں اور وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائے گئے خوبصورت کلمات کا انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ ہمارا ارادہ آپؑ کے ارشادات میں موجود گرانقدر نکات کو ترتیب وار پیش کرنا نہیں تھا۔

سید رضی کا اس کتاب کو "نہج البلاغہ" نام دینا ہی، اس بات کے اظہار کے لئے کافی ہے کہ ان کی نظر مولاؑ کے کلام کے ادبی پہلو اور اسکی بلاغت پر تھی۔ جبکہ امامؑ کے ارشادات زندگی کے لئے ایک سیدھے راستے کی نشاندہی کرنے والے اور اس راہ میں جد و جہد اور کدو کاوش کی تلقین پر مبنی ہیں، لہٰذا کیا ہی اچھا ہو تاکہ اس مقدس کتاب کا نام "نهج الحياة" یعنی روشِ زندگی، یا "نهج النضال" یعنی روشِ مبارزہ، یا "نهج الجهاد" یعنی روشِ جہاد رکھا جاتا۔ لیکن کیونکہ سید رضی چاہتے تھے کہ مولاؑ کے ارشادات کے ادبی پہلو کو اجاگر کیا جائے لہٰذا انہوں نے کتاب کا نام "نہج البلاغہ" رکھا۔

خود امامؑ نے بھی یہ کلمات اور خطبات اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لئے ارشاد نہیں فرمائے تھے۔ بلکہ اس پہلو (یعنی کلام کی ظاہری خوبصورتی) سے اہم مضامین کی وضاحت کے لئے استفادہ کیا ہے اور امامؑ کا مقصد زندگی ساز مفاہیم کا بیان اور انسانی فرائض اور ذمے داریوں کی توضیح و تشریح اور اس سلسلے میں جد و جہد کی تلقین تھا۔ یہی وجہ (یعنی سید رضی کی امامؑ کے کلام کے ادبی پہلو پر توجہ) ہے کہ سید رضی نے امامؑ کے بہت سے کلمات و خطبات اور مکتوبات کو اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا ہے اور نہج البلاغہ میں اکثر مقامات پر یوں تحریر ہے "ومن خطبة له، یا ومن كلام له، یا ومن كتاب له" یعنی آپؑ کے خطبات میں سے ایک خطبہ، یا آپؑ کے کلام میں سے ایک کلام، یا

آپؑ کے مکتوبات میں سے ایک مکتوب۔

اسی کے ساتھ ساتھ سید رضی اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کرتے کہ اس مجموعے (نہج البلاغہ) میں انہوں نے امامؑ کے تمام فصیح و بلیغ کلمات کو جمع کر دیا ہے۔ خود انہوں نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ انہوں نے ہر باب کے خاتمے پر کچھ اوراق سادہ چھوڑ دیئے ہیں تاکہ امامؑ کے مزید کلمات کے حصول کے بعد ان ابواب کو مکمل کر دیں۔ وہ کہتے ہیں : (میں نے) ہر صنف کے لئے الگ الگ باب تجویز کئے ہیں اور ہر باب کے بعد چند اوراق سادہ چھوڑ دیئے ہیں تاکہ جو کلام مجھ سے چھوٹ جائے اور بعد میں دستیاب ہو اس کا اندراج ان (سادہ اوراق) میں ہو جائے۔

ابھی حال میں ایک عالم دین نے اپنی مسلسل اور انتھک جد و جہد کے بعد امامؑ کے مزید کلام کو جمع کیا اور "نهج السعادة فی مستدرک نهج البلاغه" کے نام سے' چند جلدوں کی صورت میں اسے طبع کیا ہے۔

درحقیقت نہج البلاغہ کو علمائے امتِ اسلامیہ کے درمیان ایک بڑا مقام حاصل ہے اور مشہور و معروف اسلامی مفکرین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسکا ایک ثبوت یہ ہے کہ اب تک نہج البلاغہ کی ایک سو دو سے زیادہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور اسکے شارحین میں شیخ محمد عبدہ' علامہ شیخ عبدالحمید محی الدین' سید عبدالعزیز سید الاہل' ڈاکٹر صبحی صالحی اور مشہور عیسائی دانشور اور ادیب جارج جرداق جیسے افراد کے نام شامل ہیں۔

نہج البلاغہ کی اہمیت

جیسا کہ ہم (میں سے اکثر لوگوں) نے بھی نہج البلاغہ کے صرف انہی کلمات کو سنا ہے جو زہد اور دنیا سے پرہیز جیسے مضامین پر مشتمل ہیں اور نہج البلاغہ سے ماخوذ امیرالمومنینؑ کی فقط ایسی ہی ناصحانہ گفتگو اور خطبات سنے ہیں جو آخرت کی فکر اور موت کو یاد رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور ایسی باتوں کا ذکر بھی فاتحہ خوانی اور مرحومین کو ایصال ثواب کی

مجالس ہی میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جوان نہج البلاغہ کو ایسی ہی کتاب سمجھتے ہیں جو صرف انہی میدانوں میں رہنمائی اور ہدایت کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہج البلاغہ ایک عظیم اسلامی میراث اور انتہائی قیمتی علمی سرمایہ ہے' جو درج ذیل نمایاں خصوصیات کی حامل ہے۔

۱ ۔ اس اہم کتاب میں اخلاقی اصول' جنگی قوانین' معاشرتی نظم و نسق' سیاست و معاشرت اور اقتصاد کے خطوط کا ذکر اور ان کی تشریح و توضیح ملتی ہے۔

۲ ۔ نہج البلاغہ درحقیقت ایک آئینہ ء تمام نما ہے' جو بہت سے تاریخی حوادث کو منعکس کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس نے ان تمام حوادث کا مقابلہ کیا اور ان حوادث اور واقعات کے ظہور میں کما حقہ کردار ادا کیا۔

۳ ۔ یہ کتاب ایک عظیم ادبی سرمایہ ہے' جو بلند ادبی ذوق اور بلاغت سے بھرپور ہے۔ جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ : یہ کلام' خالق کے کلام سے کم تر لیکن تمام مخلوق کے کلام سے برتر حیثیت کا حامل ہے۔

نہج البلاغہ پر حملے

گزشتہ چند برسوں سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہج البلاغہ کی اہمیت کو کم کرنے اور اسے ناقابلِ اعتبار ثابت کرنے کی غرض سے اس پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ مثلاً مصری مجلّے "الکاتب" کے مئی ۱۹۷۵ء کے شمارے میں "استاد محمود محمد شاکر" نے نہج البلاغہ پر اعتراض کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ نہج البلاغہ کو امام علیؑ کی طرف جھوٹی نسبت دی جاتی ہے۔ اسکے تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور مصری مجلّے "الھلال" کے دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں "ڈاکٹر شفیع السید" کا اسی طرح کا ایک مقالہ شائع ہوا' جس میں اسی موضوع کو آگے بڑھایا گیا تھا۔ اور حال ہی میں کویتی مجلّے "العربی" کا فروری ۱۹۷۵ء کا شمارہ نظر سے گزرا ہے جس میں "ڈاکٹر محمد الدسوقی" نے انہی باتوں کا ذکر کیا ہے۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حملوں کا آغاز ایک ایسے وقت میں کیوں کیا گیا ہے جب امت اسلامی اپنی حقیقی میراث کی جانب پلٹ رہی ہے؟ کیا یہ لوگ امت اسلامی کو اس باعظمت اور پر شکوہ میراث سے استفادے سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ یا اسے مسلم اور ٹھوس مسائل کے بارے میں بحث و جدال کے میدان میں دھکیلنا ان لوگوں کا مقصد ہے؟

اس موقع پر ہم نہج البلاغہ کے مخالفین کے چند اعتراضات اور اشکالات کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔

☆ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سید رضی ایک غیر معمولی ادیب اور عالم تھے اور نہج البلاغہ انہی کے قلم کا شاہکار ہے، حضرت علیؑ کا کلام نہیں ہے۔

○ اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ جب ہم سید رضی کی ولادت سے بھی پہلے تالیف ہونے والی ادبی اور تاریخی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ اعتراض خود بخود لغو ہو جاتا ہے۔ ان (قدیم) کتب میں جا بجا امیر المومنینؑ کے ایسے خطبات، مکتوبات اور کلمات ملتے ہیں جنہیں سید رضی نے نہج البلاغہ میں جمع کیا ہے۔ مثلاً نہج البلاغہ کے بعض خطبات ۲۵۵ھ میں وفات پانے والے "جاحظ" کی کتاب "البیان والتبیین" میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ۲۰۲ھ میں وفات پانے والے "نصر بن مزاحم" کی کتاب "صفین" میں، ۳۱۰ھ میں وفات پانے والے "طبری" کی "تاریخِ طبری" میں اور ۳۵۶ھ میں وفات پانے والے "اصفہانی" کی تالیف "اغانی" میں بھی امیر المومنینؑ کے ایسے کلمات ملتے ہیں جن سے سید رضی نے نہج البلاغہ کی تالیف کے دوران استفادہ کیا ہے۔

اب اگر یہ حقیقت پیش نظر ہو کہ سید رضی کی وفات کا سال ۴۰۶ھ ہے، تو پھر کس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کلام کے خالق سید رضی ہیں۔ جسے ان کی ولادت سے قبل کے علما اور مولفین نے اپنی کتب میں درج کیا ہے؟

علاوہ ازایں حال ہی میں ایک دانشور نے ایک انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیا ہے جس میں انہوں نے نہج البلاغہ کے پورے کلام کی اسناد اور ماخذ کو ثابت کیا ہے۔

☆ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ نہج البلاغہ میں رسول کریمؐ کے بعض اصحاب پر تنقید اور ان کی مذمت کی گئی ہے اور ان باتوں کا حضرت علیؑ سے صادر ہونا بعید ہے؟

○ اس کا جواب یہ ہے کہ امامؑ اسلامی اصولوں پر ایمان رکھتے اور ان کے پابند تھے' آپؑ کی نظر میں معیار اور پیمانہ اسلامی اصول تھے' نہ کہ افراد۔ پس جو کوئی اسلامی اصولوں اور معیارات پر پورا اترتا ہو وہی قابلِ احترام اور لائقِ تقدیس ہے۔ چاہے وہ آج کے دور کا کوئی غلام ہی کیوں نہ ہو' اور جو کوئی اسلامی اصولوں اور معیاروں کا مخالف ہو' اسلام کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر چلے' اسے خطاوار سمجھا جائے گا' اگرچہ اس نے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ایک ہی گھر میں زندگی بسر کیوں نہ کی ہو۔ کیونکہ "ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔"

☆ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ نہج البلاغہ میں غیب کی خبریں دی گئی ہیں' جبکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور غیب کا علم نہیں رکھتا؟

○ یہ اعتراض بھی' اس وقت باطل ہو جاتا ہے جب ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ ایک موقع پر جبکہ مولاؑ غیب سے تعلق رکھنے والے کچھ موضوعات پر گفتگو فرما رہے تھے تو "بنی کلب" سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے کہا : اے امیرالمومنینؑ! آپ کو تو علم غیب حاصل ہے! یہ سن کر آپؑ مسکرائے اور فرمایا : اے برادر کلبی! یہ علم غیب نہیں بلکہ ایک صاحبِ علم (رسولؐ) سے حاصل کی ہوئی باتیں ہیں۔ علم غیب تو قیامت کی گھڑی اور ان چیزوں کے جاننے کا نام ہے جنہیں اللہ سبحانہ نے "ان اللہ عندہ علم الساعۃ" (سورہ لقمان ۳۱ ۔ آیت ۳۴) والی آیت میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ اللہ ہی جانتا ہے کہ بطون (ماؤں کے پیٹ) میں کیا ہے' نر ہے یا مادہ' بدصورت ہے یا خوبصورت' سخی ہے یا بخیل' بدبخت ہے یا خوش نصیب اور کون جہنم کا ایندھن ہو گا اور کون جنت میں انبیاء کا رفیق ۔ یہ وہ علم غیب ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہا دوسری چیزوں کا علم تو وہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو دیا اور نبیؐ نے مجھے بتایا اور میرے لئے دعا فرمائی کہ میرا سینہ اسے محفوظ رکھے اور میری پسلیاں اسے سمیٹے رہیں۔ (نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۲۶)

کیا یہ بات قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ ہے کہ خداوند عالم اپنے نبی کو بعض غیبی علوم سے مطلع کرتا ہے جبکہ خود قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے : "ذلک من انباء الغیب نوحیہ الیک۔۔۔" ((پیغمبر) یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کر رہے ہیں۔ سورہ آل عمران ۳ ۔ آیت ۴۴) اور پھر کیا رسولؐ اپنے جانشین اور خلیفہ کو بعض غیبی علوم سے مطلع نہیں کر سکتا؟

نہج البلاغہ کی روشنی میں

عدالتِ اجتماعی

حضرت علیؑ نے مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں فرمایا :

"انصف اللّٰہ وانصف الناس من نفسک، و من خاصۃ اھلک، ومن لک فیہ ھوی من رعیتک فانک الا تفعل تظلم، و من ظلم عباد اللّٰہ کان اللّٰہ خصمہ دون عبادہ، و من خاصمہ اللّٰہ ادحض حجتہ، وکان للّٰہ حربا حتی ینزع ویتوب، ولیس شیء ادعٰی الٰی تغییر نعمۃ اللّٰہ و تعجیل نقمتہ من اقامۃ علٰی ظلم فان اللّٰہ سمیع دعوۃ المضطھدین و ھو للظالمین بالمرصاد۔"

"اپنی ذات کے بارے میں اور اپنے خاص عزیزوں اور رعایا میں سے اپنے دل پسند افراد کے معاملے میں اپنے نفس اور اپنے پروردگار سے انصاف کرنا۔ کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظالم ٹھہرو گے اور جو خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو بندوں کے بجائے اللہ اس کا حریف و دشمن بن جاتا ہے اور جس کا وہ حریف و دشمن ہو اس کی ہر دلیل کو کچل ڈالتا ہے، اور ایسا شخص اللہ سے برسرِپیکار شمار کیا جائے گا جب تک کہ اپنے ظلم سے باز نہ آجائے یا توبہ نہ کرلے۔ اور اللہ کی نعمتوں کی بربادی اور اس کے عذاب میں عجلت کا کوئی سبب ظلم پر قائم رہنے سے بڑا نہیں ہے

کیونکہ اللہ مظلوموں کی پکار سنتا ہے اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔"
(نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۵۳)

عدالتِ تکوینی (کائنات میں پایا جانے والا توازن)

نظامِ ہستی پر معمولی سا غور و فکر، ہر انسان پر واضح کر دیتا ہے کہ عناصرِ کائنات کے درمیان ایک گہرا توازن موجود ہے۔ خداوند عالم نے کائنات کے ہر عنصر اور مادے کے لئے ایسے معین حدود کا تعین کیا ہے جن سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ بالفرض اگر عناصرِ کائنات کے معین اور متعین حدود بگڑ جائیں تو اس صورت میں پوری کائنات درہم برہم ہو کر تباہ و برباد ہو جائے۔ مثلاً :

۱ - زمین کے حجم کا تعین ایسی گہرائی کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس پر موجود اشیاء اور یہاں زندگی بسر کرنے والوں کے مفادات سے معمولی سا متصادم بھی نہیں۔ پس اگر فرض کریں کہ زمین کا حجم موجودہ حجم سے زیادہ ہوتا تو اسکی قوتِ جاذبہ (کششِ ثقل) بڑھ جاتی۔ جس کے نتیجے میں سطح زمین پر اشیاء کی حرکت اور نشو و نما سخت دشوار ہو جاتی۔ اور اگر اسکے برعکس ہوتا اور زمین کا حجم کم ہوتا تو اس صورت میں قوتِ جاذبہ کے کم ہو جانے کی وجہ سے کائنات تباہ و برباد ہو جاتی، ہوا زمین کی فضا سے باہر نکل جاتی اور پانی بخارات بن کے اڑ جاتا۔

۲ - زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ ۹۳ ملین میل ہے۔ اس مسافت کا تعین بھی ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ عدالتِ تکوینی جو کائنات کے ہر ہر ذرے میں کارفرما ہے کس قدر گہری اور منظم ہے۔ اب اگر زمین اور سورج کا باہمی فاصلہ اس فاصلے سے زیادہ ہوتا تو زمین پر گرمی اور حرارت کم ہو جاتی اور سردی بڑھ جانے کی وجہ سے کرۂ زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی اور اگر اسکے بالعکس فرض کیا جائے یعنی اگر زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ موجودہ فاصلے سے کم ہوتا تو سورج کی گرمی کی وجہ سے روئے زمین کی ہر چیز جل کر بھسم ہو جاتی اور زمین پر زندگی کا نام و نشان نہ ملتا۔

۳ - جیسا کہ ہم جانتے ہیں زمین پر ایک کرۂ ہوا (Atmosphere) چھایا ہوا ہے، جو ایک معین ضخامت رکھتا ہے۔ یہ ہوائی خول زمین پر زندگی کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہے۔ اگر اس خول کی ضخامت میں تھوڑی سی بھی کمی واقع ہو جائے تو آسمانی پتھروں اور فضا سے گرنے والے شہابِ ثاقبوں کی وجہ سے زمین پر زندگی دوبھر ہو جائے۔ یاد رہے کہ ایک دن میں فضا سے ڈیڑھ لاکھ شہابِ ثاقب اور آسمانی پتھر زمین کی سمت آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی رفتار بندوق سے چلائی جانے والی گولی کی رفتار سے ۹۰ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے برعکس فرض کیا جائے۔ یعنی اس ہوائی خول کی ضخامت موجودہ ضخامت سے زیادہ ہو جائے تو اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ زمین پر سورج کی شعائیں نہیں پہنچ پائیں گی اور اسکے نتیجے میں ہونے والے نقصان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

نظامِ کائنات میں نظر آنے والے اس گہرے توازن کی حالت کو جس کی بنیاد پر کائنات کا ایک ایک عنصر اپنی معین حدود میں عمل کر رہا ہے ہم "عدل یا عدالت" کا نام دے سکتے ہیں اور ہمارے مفروضہ حالات جن میں کائنات کا مواد اور اسکے عناصر اپنی معین حدود سے خارج ہوتے ہیں اسے ہم "ظلم" کہہ سکتے ہیں۔

نظامِ ہستی پر جب تک "عدالت" کا راج ہے اس وقت تک کائنات خیر و سعادت سے معمور رہے گی لیکن اگر نظامِ ہستی پر "ظلم" کی حکومت ہو جائے تو اس صورت میں خرابی اور نابودی کے سوا دنیا کا مقدر کچھ اور نہ ہو گا۔

پس اس وضاحت کے نتیجے میں ہم نے یہ جان لیا ہے کہ "عدالتِ تکوینی" اور "ظلمِ تکوینی" کیا چیز ہے، اب ہم "عدالتِ اجتماعی" اور "ظلمِ اجتماعی" کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

عدالتِ اجتماعی

کائنات میں موجود تمام مواد، ہر نوع کا مادہ اور ہر ایک جسم معین حدود رکھتا ہے اور

ان ہی حدود میں رہنے کا پابند ہے۔ اسی چیز کو عدالت کہتے ہیں، جبکہ ان حدود سے تجاوز ظلم کہلاتا ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرے میں خداوند عالم نے معاشرے کے ہر فرد اور گروہ کے حدود اور حقوق معین کئے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی معاشرے میں انسان اپنے معین شدہ حدود کے مطابق عمل کریں اور اپنے طے شدہ حقوق پائیں تو یہ ایک عادلانہ معاشرہ کہلائے گا۔ لیکن اگر افرادِ معاشرہ اپنی حدود سے تجاوز کریں اور ان کے حقوق سلب کئے جا رہے ہوں تو یہ معاشرے میں ظلم کا دور دورہ کہلائے گا۔

جس طرح "عدالتِ تکوینی" کائنات کے استحکام اور بقاء کی محافظ ہے اور "ظلمِ تکوینی" اس کی تباہی اور بربادی کا موجب ہوتا ہے، بالکل اسی طرح "عدالتِ اجتماعی" معاشرے اور اسکی سعادت نیز خیر و صلح کی محافظ ہے اور "ظلمِ اجتماعی" معاشرے کے پیکر کو درہم برہم کرنے والا اور اسکی بدبختی کا باعث ہے۔ آیئے اسی بات کو امیرالمومنینؑ کی زبانی سنتے ہیں، آپؑ فارس میں اپنے گورنر سے فرماتے ہیں :

"استعمل العدل، واحذر العسف والحیف، فان العسف یعود بالجلاء والحیف یدعو الی السیف"

"عدل و انصاف کی راہ پر چلو اور بے جا دباؤ اور ظلم سے پرہیز کرو کیونکہ بے جا دباؤ عوام کی تم سے دوری اور گریز کا سبب بنے گا اور ظلم تمہارے خلاف لوگوں کو تلوار اٹھانے پر مجبور کردے گا۔"

(نہج البلاغہ - کلمات قصار ۴۷۶)

اس مقام پر ایک اہم حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے اور وہ یہ کہ انسان کی خالق بھی وہی ہستی ہے جس نے اس کون و مکان کو پیدا کیا ہے اور انسانی سماج اسی کائنات کا ایک اٹوٹ جزو ہے جس پر عدالت حاکم ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ خداوند متعال کائنات کے ذرے ذرے پر تو عدالت نافذ کرے لیکن انسانی معاشرے کو ظلم و ستم کے ساتھ رہنے کی اجازت دے؟

در حقیقت جس طرح خالقِ کائنات ایک ہی ہے اسی طرح اسکا عطا کردہ نظام بھی

ایک ہی ہونا چاہئے۔ قرآن کریم اس حقیقت پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"الذی خلق سبع سماوات طباقاما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفاوت فارجع البصر هل تریٰ من فطور؟ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاساوهو حسیر۔"

"اسی نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کئے ہیں اور تم رحمان کی خلقت میں کسی طرح کی بے نظمی اور فرق نہ دیکھو گے۔ پھر دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھو کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ اسکے بعد بار بار نگاہ ڈالو دیکھو' نگاہ تھک کر پلٹ آئے گی لیکن کوئی عیب نظر نہ آئے گا۔"

(سورہ ملک ٦٧ ۔ آیت ۳'۴)

خداوند متعال انسان کو کرامت اور سربلندی کا مالک دیکھنا چاہتا ہے اور اسے اپنی دوسری مخلوقات پر فضیلت بخشنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے انسان کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ خود سے منزلیں سر کرتا ہوا کمال حاصل کرے۔ اللہ رب العزت انسان پر عدالت کو بالجبر فرض نہیں کرتا جیسا کہ اس نے سورج اور زمین کو جبراً ایک عادلانہ نظام کا تابع بنایا ہوا ہے بلکہ انسان کو عدالت کا راستہ دکھا کر اسے اس پر چلنے کی تاکید و تشویق کرتا ہے اور اسی طرح ظلم و ستم کے راستے کی نشاندہی کر کے انسان کو اس پر چلنے سے منع اور متنبہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کے سلسلے میں انسان کو آزاد چھوڑتا ہے' چاہے تو انسان ظلم کا راستہ اپنائے' چاہے تو عدالت کی راہ اختیار کرے۔

معاشرے میں ظلم کی مختلف شکلیں

نہج البلاغہ میں عدالت کے مفہوم اور اسکے اجتماعی پہلو کی وضاحت کے لئے معاشرتی ظلم اور ناانصافی کی مختلف شکلوں اور اس بارے میں امام علیؑ کے موقف کو واضح کیا جانا

ضروری ہے، کیونکہ چیزوں کو ان کی ضد ہی کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔

۱ : فقر و محرومی

خداوند عالم، جو انسانوں کا خالق ہے، اس نے ایک ایک انسان حتیٰ ہر زندہ موجود کے رزق و روزی کی فراہمی کو اپنے ذمے لیا ہے۔ اس بارے میں ارشاد الٰہی ہے :

"وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا"

"اور زمین پر حرکت کرنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو۔" (سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۶)

یہ روزی کائنات کے اندر اور اسکی نعمتوں میں پنہاں ہے۔ پس ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ خدا کے ان خزانوں سے اپنی روزی اور اپنا حصہ وصول کرے۔ البتہ ایسے افراد جو جسمانی یا معاشرتی اعتبار سے اس قابل نہیں کہ براہ راست قدرت کے ان خزانوں سے اپنی روزی اور حصہ حاصل کر سکیں، تو کیا ان کا ان خزانوں پر کوئی حق نہیں اور فقر و محرومی کی زندگی ان کا مقدر ہے اور انہیں بھوک سے مر جانا چاہئے؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں بلکہ خداوند عالم نے محنت مشقت اور کام و عمل کی طاقت رکھنے والوں نیز دولت مندوں پر واجب کیا ہے کہ وہ ان ناتواں لوگوں اور محتاجوں کی ضروریات اور روزی کا بندوبست کریں۔ ارشاد الٰہی ہے :

"وفی اموالھم حق للسائل والمحروم"

"اور ان کے اموال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم افراد کے لئے ایک حق ہے۔" (سورہ ذاریات ۵۱۔ آیت ۱۹)

پس اگر مالدار اور ثروت مند لوگ ضرورت مندوں اور محتاجوں کی محرومیت کے خاتمے کے لئے ان کی معاشی ضروریات پوری نہ کریں تو یہ ظلم، تعدی اور تجاوز ہے اور خداوند عالم ان سے خوش نہ ہو گا اور اسلام کی عادلانہ شریعت اس بات کو پسند نہیں کرتی۔ آیئے ہمارے ساتھ دیکھئے امیرالمومنینؑ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں :

"ان اللہ سبحانہ فرض فی اموال الاغنیاء اقوات الفقراء فما جاع فقیر الا بما متع بہ غنی' واللہ تعالٰی سائلھم عن ذٰلک" (نہج البلاغہ - کلمات قصار ۳۲۸)

"خداوند عالم نے دولتمندوں کے مال میں فقیروں کا رزق مقرر کیا ہے لہٰذا اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے دولت کو سمیٹ کر رکھا ہوا ہے اور خدائے بزرگ و برتر اس سے اس (عمل) کا مواخذہ کرے گا۔"

امامؑ نے مکہ میں اپنے گورنر "قثم بن عباس" کو تحریر کیا :

"وانظر الٰی ما اجتمع عندک من مال اللہ فاصرفہ الٰی من قبلک من ذوی العیال والمجاعۃ مصیبا بہ مواضع الفاقہ والخلات"

"جو اموال تمہارے پاس جمع ہو جائیں ان پر نظر رکھو اور تمہارے یہاں جو عیال دار اور بھوکے ننگے لوگ ہوں ان پر صرف کردو' یہ لحاظ رکھتے ہوئے کہ یہ (مال) حقیقی محتاجوں اور ضرورت مندوں تک پہنچے۔"

(نہج البلاغہ - مکتوب ۶۷)

آپؑ نے مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں یوں فرمایا :

"اللہ اللہ فی الطبقۃ السفلٰی من الذین لا حیلۃ لھم من المساکین والمحتاجین واھل البوسٰی والزمنٰی۔۔۔"

"اللہ سے ڈرو اس پسماندہ طبقے کے بارے میں جو مساکین 'محتاج ' فقراء اور معذور افراد کا طبقہ ہے' جس کا کوئی سہارا نہیں۔"

(نہج البلاغہ - مکتوب ۵۳)

اگر بے درد دولتمندوں اور خوش حال لوگوں کا طبقہ عدالت کی راہ سے ہٹ جائے'

تجاوز کرے اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کو فقر و محرومی کا عذاب سہنے کے لئے تنہا چھوڑ دے تو کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو گا اسکے خطرناک نتائج درج ذیل ہوں گے۔

الف : طبقاتی تفریق

ایسے حالات میں چند لوگوں کے پاس دولت کے انبار لگ جاتے ہیں اور لوگوں کی اکثریت محرومی اور مشکلات کی شدت سے پیچ و تاب کھاتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے دولتمندوں کی دولت میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور محروم و فقیر لوگ رنج و الم کے ساتھ دردناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حضرتؑ فرماتے ہیں :

"اضرب بطرفک حیث شئت من الناس فهل تبصر الا فقیرا یکابد فقرا او غنیا بدل نعمة اللّٰه کفرا"

"جدھر چاہو لوگوں پر نگاہ دوڑاؤ، تم یہی دیکھو گے کہ ایک طرف کوئی فقیر فقر و فاقہ جھیل رہا ہے اور دوسری طرف دولتمند نعمتوں کو کفرانِ نعمت سے بدل رہا ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۷)

امام علیؑ انتہائی صریح اور دو ٹوک الفاظ میں طبقاتی معاشرے پر تنقید کرتے ہیں اور اسے قابل مذمت قرار دیتے ہیں۔ بصرہ میں اپنے گورنر "عثمان بن حنیف" کے نام اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

"وما ظننت انک تجیب الٰی طعام قوم، عائلهم مجفو، و غنیهم مدعو"

"مجھے تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت قبول کر لو گے جن کے یہاں فقرا و ناداروں کا داخلہ ممنوع ہو گا اور جہاں دولتمند مدعو ہوں گے۔" (نہج البلاغہ - مکتوب ۴۵)

ب : گمراہی اور جرائم

مسلسل فقر و محتاجی در حقیقت جرائم اور بد عنوانیوں بشمول چوری، لوٹ مار اور

دھوکہ دہی وغیرہ کا موجب ہے۔ اس بارے میں امام علیؑ فرماتے ہیں۔

"واذابخل الغنی بمعروفه باع الفقیر اخرته بدنیاه"

"اور اگر غنی اپنی نیکیوں میں بخل کرے گا تو فقیر بھی آخرت کو دنیا کے عوض بیچنے پر آمادہ ہو جائے گا۔" (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۳۷۲)

ج : معاشرتی بے چینی اور بد نظمی

پس ضرورت مند اور محتاج لوگ کب تک بھوک کی اذیت اور محرومیت برداشت کریں گے؟ یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا اور وہ ایک انقلاب اٹھادیں گے۔ امام فرماتے ہیں :

"والحیف یدعوالی السیف"

"اور ظلم و ستم (لوگوں کو) تلوار اٹھانے پر مجبور کردے گا۔"

(نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۷۶)

۲ : یکساں مواقع فراہم نہ ہونا

یہ معاشرتی ظلم و ناانصافی کی شکلوں میں سے دوسری شکل ہے۔ اس شکل میں معاشرے میں موجود مالی اور اقتصادی مواقع سے فائدہ اٹھانے کا موقع صرف ایسے گروہ کو فراہم ہوتا ہے جس کا تعلق حکومتی مشنری سے ہو اور جو حاکمِ وقت کے اقربا میں سے ہوں۔ اس وجہ سے قیادت و حکومت کے مراکز پر نااہل لوگ قابض ہو جاتے ہیں اور پھر لوگوں کے حقوق اور ان کی شخصیت، کرامت اور عزت و احترام سے کھیلا جاتا ہے۔ جبکہ اہل اور لائق افراد مواقع دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو میدان سے باہر نکال لیتے ہیں۔ بنابرایں معاشرہ ان کے علم و تجربے، خدمات اور مختصر یہ کہ ان کے مفید وجود سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت علیؑ نے اس بارے میں سخت موقف کا مظاہرہ کیا اور جوں ہی آپؑ نے

خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی فوراً ہی وہ تمام سیاسی اور اقتصادی امتیازات ان لوگوں سے سلب کر لئے جو انہیں سابق دورِ حکومت میں خاندان اور قبیلے اور دوستی کی بنیاد پر دیئے گئے تھے اور اس بارے میں فرمایا :

"واللہ لو وجدتہ (المال) قد تزوج بہ النساء، و ملک بہ الاماء، لردتہ، فان فی العدل سعۃ، ومن ضاق علیہ العدل فالجور علیہ اضیق"

"خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اسے بھی واپس پلٹا لیتا، چونکہ عدل میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے اور جس کو عدل کی صورت میں تنگی محسوس ہو اسے ظلم کی صورت میں تو اور زیادہ تنگی محسوس ہو گی۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۵)

امام علیؑ نے خلافت سنبھالتے ہی حکومتی مشنری میں انقلابی تبدیلیوں کا آغاز کیا۔ سابقہ حکومت کے تمام گورنروں کو معزول کر دیا۔ انہی گورنروں میں شام کا طاقتور گورنر معاویہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح حضراتِ طلحہ و زبیر کے سلسلے میں بھی سخت موقف اختیار کیا۔ آپؑ نے سیاست میں مساوات کو رواج دیا اور لوگوں کے درمیان مال کی تقسیم کے دوران کوئی فرق نہ رکھا۔ اور جب آپؑ سے اس بارے میں بعض لوگوں نے گلا کیا تو آپؑ نے اپنی عادلانہ سیاست کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :

"اتامرونی ان اطلب النصر بالجور فیمن ولیت علیہ! واللہ لا اطور بہ ما سمر سمیر، وما ام نجم فی السماء نجما! لو کان المال لی لسویت بینھم فکیف وانما المال مال اللہ"

"کیا تم مجھے اس بات پر آمادہ کرنا چاہتے ہو کہ میں جن رعایا کا ذمے دار بنایا گیا ہوں ان پر ظلم کر کے چند افراد کی امداد حاصل کر لوں؟ خدا کی قسم

جب تک اس دنیا کا قصہ چلتا رہے گا اور ایک ستارہ دوسرے ستارے کی طرف جھکتا رہے گا۔ میں ایسی چیز کے قریب بھی نہ پھٹکوں گا۔ یہ مال اگر میرا ذاتی ہوتا تب بھی میں اسے برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال اللہ کا مال ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۴)

حد یہ ہے کہ ایک روز جب آپؑ کے بھائی عقیل بن ابی طالب' آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ انہیں بیت المال سے دوسرے مسلمانوں سے زیادہ مال دیا جائے تو آپؑ نے ان کی درخواست کو بھی مسترد کردیا اور جب عقیل نے اپنی درخواست پر اصرار کیا تو امامؑ نے اپنے بھائی کو جو عملی جواب دیا اسکی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"واللہ لقد رایت عقیلا و قد املق' حتی استما حتی من برکم صاعاء ورایت صبیانہ شعث الشعور' رغبر الالوان' من فقرھم کانما سودت وجوھھم بالعظلم وعاودنی موکدا' وکرر علی القول مرددا' فاصغیت الیہ سمعی' فظن انی ابیعہ دینی' واتبع قیادہ مفارقا طریقتی فاحمیت لہ حدیدۃ' ثم ادنیتھا من جسمہ لیعتبر بھا فضج ضجیج ذی دنف من المھا' وکادان یحترق من میسمھا' فقلت لہ : ثکلتک الثواکل یا عقیل ! اتئن من حدیدۃ احماھا انسانھا للعبہ' و تجرنی الیٰ نار سجرھا جبارھا لغضبہ اتئن من الاذی ولا اتئن من لظیٰ"

"خدا کی قسم میں نے عقیل کو خود دیکھا ہے کہ انہوں نے فقروفاقے کی بنا پر گندم میں تمہارے حصے میں سے تین کلو کا مطالبہ کیا تھا۔ جب کہ ان کے بچوں کے بال غربت کی بنا پر بکھرے ہوئے تھے اور ان کے چہروں کے

رنگ یوں بدل چکے تھے جیسے انہیں تیل چھڑک کر سیاہ بنا دیا گیا ہو اور جب انہوں نے بار ہا مجھ سے تقاضا کیا اور مکرر اپنے مطالبے کو دہرایا تو میں نے ان کی بات توجہ سے سنی۔ اس پر وہ یہ سمجھے کہ شاید میں اپنا دین بیچنے اور اپنے راستے کو چھوڑ کر ان کے مطالبے پر چلنے کو تیار ہو گیا ہوں۔ لیکن میں نے (ان کو ہوشیار اور بیدار کرنے کی غرض سے) ان کے لئے لوہا گرم کرایا اور پھر اسے ان کے جسم کے قریب لے گیا تاکہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ انہوں نے لوہا دیکھ کر یوں چیخ و پکار بلند کی جس طرح کوئی بیمار اپنے درد و الم سے چیختا پکارتا ہے اور قریب تھا کہ ان کا جسم اس (گرم لوہے) کے داغ دینے سے جل جائے تو میں نے کہا: رونے والیاں آپ کے غم میں روئیں، اے عقیل! آپ اس لوہے پر چلا اٹھے جسے ایک انسان نے فقط ہنسی مذاق میں تپایا ہے اور مجھے اس آگ کی طرف کھینچ رہے ہیں جسے خدائے جبار نے اپنے غضب کی بنیاد پر بھڑکایا ہے۔ آپ اذیت سے چیخیں چلائیں اور میں اذیت سے نہ چلاؤں؟۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۲۲۱)

۳ : قانون کی گرفت سے محفوظ رہنا

سماجی ظلم کی تیسری شکل یہ ہے کہ قانون صرف غریب غربا کے لئے حرکت میں آئے لیکن صاحبانِ مقام و ثروت قانون کی گرفت سے محفوظ رہیں، یہ گروہ کتنا ہی گمراہ اور بے راہ رو ہو قانون کبھی اسکا راستہ نہ روک سکے۔ امام علیؑ نے ظلم و ستم کے اس طریقے کے خلاف بھی سخت اور دوٹوک موقف اختیار کیا۔ اس بارے میں فرماتے ہیں:

"الذلیل عندی عزیز حتّٰی اخذ الحق له، والقوی عندی ضعیف حتی آخذ الحق منه"

"یاد رکھو کہ تمہارا ذلیل میری نظر میں عزیز ہے جب تک کہ میں اس کا

حق نہ دلوادوں اور تمہارا عزیز میری نظر میں ذلیل ہے جب تک کہ اس سے دوسروں کا حق وصول نہ کرلوں۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۳۷)

جب ایک موقع پر آپؑ کے کسی فوجی اہلکار یا افسر نے، جسے قانونی تحفظ حاصل تھا، اپنے عہدے سے غلط فائدہ اٹھایا اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا تو حضرتؑ نے اس قانونی تحفظ، اپنے منصب سے سوء استفادہ اور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے سلسلے کے خاتمے کے لئے ان علاقوں کے خراج جمع کرنے والوں اور وہاں کے والیوں کے نام ایک مکتوب ارسال کیا جہاں سے آپؑ کی فوج کو گزرنا تھا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد فانی قد سیرت جنودا ھی مارة بکم ان شاء اللّٰہ، وقد اوصیتھم بما یجب للہ علیھم من کف الاذی و صرف الشدی، وانا ابرا الیکم والی ذمتکم من معرة الجیش الامن جوعة المضطر لا یجد عنھا مذھبا الی شبعہ، فنکلوا من تناول منھم شیئا ظلما عن ظلمھم وکفوا ایدی سفھائکم عن مضارتھم والتعرض لھم فیما استثنیناہ، منھم وانا بین اظھر الجیش فادفعوا الی مظالمکم، وما عراکم مما یغلبکم من امرھم و مالا تطیقون دفعہ الا باللہ وبی فانا اغیرہ بمعونة اللہ ان شاء اللّٰہ"

"اما بعد! میں نے کچھ فوجیں روانہ کی ہیں جو عنقریب تمہارے علاقے سے گزریں گی اور میں نے انہیں ان تمام باتوں کی نصیحت کردی ہے جو ان پر واجب ہیں کہ کسی کو اذیت نہ دیں اور کسی کو تکلیف میں مبتلا نہ کریں۔ اور میں تمہیں اور تمہارے اہل خانہ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر فوج والے کوئی دست درازی کریں تو اس سے میں بے تعلق ہوں (کیونکہ انہیں کسی کو نقصان و آزار پہنچانے کا کوئی حق نہیں) مگر یہ کہ کوئی شخص

بھوک سے مضطر ہو اور اسکے پاس پیٹ بھرنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ اسکے علاوہ اگر کوئی ظالمانہ دست درازی کرے تو اس کو سزا دینا تمہارا فرض ہے۔ لیکن اپنے سرپھروں کو سمجھا دو کہ جن حالات کو میں نے مستثنیٰ قرار دیا ہے ان میں کوئی شخص کسی چیز کو ہاتھ لگانا چاہے تو اس سے مقابلہ نہ کریں اور اسے نہ ٹوکیں۔ پھر اسکے بعد میں لشکر میں موجود ہوں۔ اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں اور سختیوں کی شکایت مجھ سے کرو، اگر تم انہیں (اس وقت تک) دور کرنے کے قابل نہیں ہو، جب تک کہ اللہ کی مدد اور میری امداد شامل نہ ہو۔ میں انشاء اللہ خدا کی مدد سے حالات ٹھیک کر دوں گا۔" (نہج البلاغہ - مکتوب ۶۰)

۴ : دوسروں کے حقوق کی پامالی

معاشرے کے ہر فرد کے کچھ حقوق اور احترام ہوتے ہیں اور ان حقوق و احترام اور آزادیوں کی پامالی ایک قسم کا ظلم ہے اور خداوند عالم اس جرم میں ظالم کو سزا اور عذاب کا مزا چکھائے گا اور اس سزا کی اذیت اور تکلیف اس ظلم سے کہیں زیادہ شدید اور سخت ہو گی جو اس نے مظلوم پر روا رکھا ہو گا۔ اس بارے میں امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے :

"یوم المظلوم علی الظالم اشد من یوم الظالم علی المظلوم"

"مظلوم کے ظالم پر قابو پانے کا دن اس دن سے کہیں زیادہ سخت ہو گا جس میں ظالم مظلوم کے خلاف اپنی طاقت دکھاتا ہے۔"

(نہج البلاغہ - کلمات قصار ۲۴۱)

بنا برایں فقراء اور محروموں کا اس ظلم کی بھینٹ چڑھنا انتہائی ناگوار اور ناپسندیدہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کی وہ سکت نہ رکھتے ہوں اور جس کے سامنے اپنے مسلمہ حق کا

تحفظ کرنے سے عاجز ہوں۔ امامؑ فرماتے ہیں :

"ظلم الضعیف افحش الظلم"

"بدترین ظلم وہ ہے جو کسی کمزور و ناتواں پر کیا جائے۔"

(نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۳۱)

نیز فرماتے ہیں :

"وہو سالمن (خصمہ عنداللہ) الفقراء والمساکین"

"اور سب سے زیادہ بدبختی اس کے لئے ہے جس کے دشمن بارگاہ الٰہی میں فقراء و مساکین ہوں۔" (نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۲۶)

افرادِ معاشرہ اور حکام کا فرض ہے کہ ظالم کا ہاتھ روکیں اور اس سے مظلوموں کے مسلمہ حقوق بازیاب کرائیں۔ اس بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"لانصفن المظلوم من ظالمہ"

"خدا کی قسم میں مظلوم کو ظالم سے اسکا حق دلاؤں گا۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۳۴)

نیز فرماتے ہیں :

"لن تقدس امة لا یوخذ للضعیف فیها حقه من القوی غیر متعتع"

"وہ امت پاکیزہ کردار نہیں ہو سکتی ہے جس میں کمزور کو طاقتور سے آزادی کے ساتھ اپنا حق لینے کا موقع نہ دیا جائے۔"

(نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۵۳)

ظلم کے مقابل ہمارا موقف کیا ہونا چاہئے

اب جبکہ ہم معاشرے میں موجود ظلم کی مختلف شکلوں سے آگاہ ہو چکے ہیں اور اس قابل ہو گئے ہیں کہ معاشرے میں موجود ظلم کی مختلف صورتوں کو پہچان سکیں، تو سوال یہ

اٹھتا ہے کہ ان حالات اور صورتوں کے مقابل ہمارا موقف کیا ہونا چاہئے؟ کیا صرف تماش بین بنے رہیں؟ یا یہ کہ معاشرتی ظلم کے خلاف اپنی ذمے داری محسوس کریں اور اسکے خاتمے کی مناسب تدابیر اپنائیں؟

اس سلسلے میں امیرالمومنینؑ بیدار ضمیر مسلمانوں کی کیا ذمے داری قرار دیتے ہیں' درج ذیل سطور اس موضوع کی وضاحت پر مشتمل ہیں۔

☆ ظلم دیکھ کر غم اور دکھ کا احساس کرنا

اگر کوئی معاشرتی ظلم ہماری نظروں میں آئے' یا ایسے کسی ظلم کی خبر ہم سنیں' تو ہم پر واجب ہے کہ اس سے لاتعلقی کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ ہمارے ضمیر میں ایک کشمکش کی حالت پیدا ہو جائے' جو ہمیں اسکے خلاف جد و جہد پر آمادہ کرے۔ امیرالمومنینؑ ایک خطبے میں اس دور میں ہونے والے مظالم بیان کرتے ہوئے اپنے سامعین کو ترغیب دیتے ہیں کہ ان حالات پر دکھ اور افسوس کا اظہار کریں بلکہ انہیں اس راہ میں موت و شہادت کو گلے لگانے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

"ولقد بلغنی ان الرجل منهم کان ید خل علی المراۃالمسلمۃ" والا خری المعاهدۃ فینتزع حجلها وقلبها و قلائدها ورعثها' ما تمتنع منه الا بالا ستر جاع والا ستر حام ثم انصر فوا وافرین مانال رجلا منهم کلم ولا اریق لهم دم فلوان امرا مسلمامات من بعد هذا اسفاما کان به ملوما' بل کان به عندی جدیرا۔"

"اور مجھے تو یہاں تک خبر ملی ہے کہ دشمن کا ایک سپاہی مسلمانوں یا مسلمانوں کے معاہدے میں رہنے والی عورت کے پاس آتا تھا اور اسکے پیروں کے کڑے' ہاتھوں کے کنگن' گلے کے گلوبند اور کان کے گوشوارے اتار لیتا تھا اور وہ سوائے استرجاع (اناللہ وانا الیہ

راجعون) پڑھنے اور رحم و کرم کی درخواست کرنے کے کچھ نہیں کر سکتی تھی اور وہ سارا ساز و سامان لے کر چلا جاتا تھا' نہ کوئی زخم کھاتا تھا اور نہ کسی طرح کا خون بہتا تھا۔ اس صورتحال (کو دیکھنے) کے بعد اگر کوئی مردِ مسلمان صدمے سے مر بھی جائے تو قابلِ ملامت نہیں ہے' بلکہ میرے نزدیک حق بجانب ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۷)

☆ ظالم کے خلاف مظلوم کا ساتھ دینا

امامؑ نے اپنے فرزندوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو جو آخری وصیت تحریر کی اس میں فرمایا :

"کونا للظالم خصما وللمظلوم عونا"

"ظالم کے سرسخت دشمن اور مظلوم کے مونس و مددگار بننا۔"

(نہج البلاغہ - مکتوب ۴۷)

☆ عدل کے قیام اور ظلم کے خاتمے کے لئے عملی جدوجہد کرنا

عدالتِ اجتماعی کے قیام اور ظلم و ستم کی بیخ کنی کے لئے جدوجہد ہر بیدار اور روشن ضمیر انسان کی ذمے داری ہے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں :

"اخذ اللہ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظة ظالم ولا سغب مظلوم"

"خداوند عالم نے علما سے عہدہ و پیمان لیا ہے کہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

نہج البلاغہ کی روشنی میں

حق

امام علی علیہ السلام نے فرمایا :

"فلا یکن افضل مانلت فی نفسک من دنیاک بلوغ لذۃ او شفاء غیظ، ولکن اطفاء باطل او احیاء حق"

"لذت کا حصول اور جذبہ ء انتقام کو ٹھنڈا کرنا ہی تمہاری نظروں میں دنیا کی بہترین و برترین چیز نہ ہو۔ بلکہ تمہاری نظروں میں بہترین امور باطل کو مٹانا اور حق کو زندہ کرنا ہونا چاہئیں۔" (نہج البلاغہ ۔ مکتوب ٦٦)

ثابت اور صحیح امر کو "حق" کہتے ہیں، اسکی ضد باطل یا نامعقول چیز ہے، جس کا وجود ناپائیدار ہوتا ہے۔ بنابرایں حق ایک ایسا چوکھٹا (FRAME) ہے جس کے اندر زندگی کے تمام فکری اور عملی معاملات داخل ہیں، (یا ایک ایسا دائرہ ہے جو زندگی کے تمام فکری اور عملی مسائل کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے) پس یہاں فکرِ حق اور فکرِ باطل، گفتارِ حق اور گفتارِ باطل، عملِ حق اور عملِ باطل، موقفِ حق اور موقفِ باطل پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسی فکر جو حقیقت سے موافق و سازگار ہو اسے فکرِ حق کہتے ہیں۔ ایسی گفتار جو حقیقت پر مبنی ہو اسے گفتارِ حق کہتے ہیں اور ایسا عمل جو حقیقت پر استوار ہو وہ عملِ حق ہے۔

امیر المومنینؑ حق کی وسعت اور اسکے احاطے کے بارے میں فرماتے ہیں :

"حق و باطل ولکل اھل"

"(ہر چیز میں) ایک حق ہوتا ہے اور ایک باطل اور کچھ حق والے ہوتے ہیں اور کچھ باطل والے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ نمبر ۱۶)

انسان کو ہر معاملے میں، خواہ اس معاملے کا تعلق فکری مسائل سے ہو خواہ عملی مسائل سے، حق کا تابع ہونا چاہئے اور اپنے آپ کو باطل خیالات رکھنے، باطل کی حمایت میں بولنے، یا باطل عمل انجام دینے سے باز رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ایسا فرد جو باطل کی جانب میلان رکھتا ہو، وہ دراصل اپنے آپ کو فریب دیتا ہے اور اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ اس لئے کہ آخر کار اسے حق و حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا اگر کفار خود کو فریب دیتے ہوئے قیامت، روزِ حساب اور محشر کا انکار کرتے ہیں تو ان کا یہ باطل عقیدہ حق کو بدل نہیں سکتا بلکہ وہ ایک روز اچانک خود کو حق و حقیقت کے سامنے پائیں گے اور اس موقع پر حق کے سامنے سر جھکا دینے کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہو گا لیکن اس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا ہو گا۔ اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے :

"ویوم یعرض الذین کفروا علی النار الیس ھذا بالحق قالوا بلی وربنا قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون۔

"اور جس دن یہ کفار جہنم کے سامنے پیش کئے جائیں گے کہ کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو سب کہہ دیں گے کہ بے شک پروردگار کی قسم یہ سب حق ہے۔ تو ارشاد ہو گا کہ اب عذاب کا مزہ چکھو کہ تم پہلے اسکا انکار کر رہے تھے۔" (سورہ احقاف ۴۶ - آیت ۳۴)

ایک وقت تھا کہ کمیونزم کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ شخصی ملکیت اور حبِ ذات انسان کی اصل جبلتیں (Instincts) نہیں بلکہ انہیں اس نے خارج سے کسب کیا ہے۔ لہٰذا انہیں مسترد کرنا اور سرے سے ختم کرنا ممکن ہے۔ لیکن جب کمیونسٹ انقلاب کے بعد ان کا سامنا حقیقت سے ہوا تو وہ شخصی ملکیت کی رد پر مبنی اپنے نظریات سے پیچھے

ہٹ گئے اور اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ شخصی ملکیت کے خاتمے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہے اور انہوں نے اس مدت اور زمانے کو سوشلسٹی مرحلے کا نام دیا۔

دوسری طرف مغرب عرصہ دراز تک قاتل کے لئے سزائے موت کا مخالف رہا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ سزائے موت کی جگہ عمر قید لوگوں کو اس جرم سے باز رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن حال ہی میں انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور ان پر ثابت ہو گیا ہے کہ قصاص ہی میں حیات ہے اور در حقیقت خون کا بدلہ خون ہی ہے۔ اب مغرب سے بھی حق و حقیقت پر مبنی اس قانون کی طرف پلٹنے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اس صورتحال کے بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"من صارع الحق صرعه"

"جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔"

(نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار ۴۰۸)

"من ابدی صفحته للحق هلک"

"جو حق کے مقابلے میں سر اٹھاتا ہے' وہ تباہ ہو جاتا ہے۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۶)

"وانه لن یغنیک عن الحق شیء ابدا"

"اور دیکھو کوئی چیز تمہیں حق سے بے نیاز نہیں بنا سکتی۔"

(نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۵۹)

حق کا معیار کیا ہونا چاہئے

شاید بہت سے لوگ حق کی پیروی کی جانب مائل ہوں اور حق کے پابند ہونا چاہتے ہوں لیکن حق کی پہچان اور تشخیص کے سلسلے میں انہیں مشکلات کا سامنا ہو۔ ایسے لوگوں کی اکثریت حق تک پہنچنے کے لئے غلط معیارات اور پیمانوں سے استفادہ کرتی ہے' جس کے نتیجے میں وہ باطل کے کیمپ میں جا پھنستے ہیں جبکہ وہ خود کو حق کا پیروکار سمجھ رہے

ہوتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے لوگوں کو بد ترین لوگ اور انتہائی خسارہ اٹھانے والا قرار دیتا ہے۔

"قل هل ننبئكم بالا خسرين اعمالا ○ الذين ضل سعيهم فى الحيٰوة الدنيا و هم يحسبون انهم يحسنون صنعا"

"پیغمبر کیا ہم آپ کو ان لوگوں کے بارے میں اطلاع دیں جو اپنے اعمال میں بد ترین خسارے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں بھک گئی ہے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اچھے اعمال انجام دے رہے ہیں۔" (سورہ کہف ۱۸۔ آیت ۱۰۳، ۱۰۴)

حضرت علیؑ خوارج کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان کی خامی یہ بتاتے ہیں کہ وہ حق تک پہنچنے کے معیار اور پیمانے کی تشخیص میں غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں، گو کہ حق کی پیروی اور متابعت کے خواہاں ہیں۔ فرماتے ہیں :

" لا تقاتلوا الخوارج بعدى فليس من طلب الحق فاخطاه كمن طلب الباطل فادركه"

" میرے بعد خوارج کو قتل نہ کرنا، اسلئے کہ جو حق کا طالب ہو اور اسے نہ پاسکے وہ اس کی طرح نہیں ہے کہ جو باطل ہی کی طلب میں ہو اور پھر اسے پا بھی لے" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۵۹)

اب دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ کی نظر میں حق کا پیمانہ کیا ہے؟

کیا معیار یہی ہے کہ جس چیز کے بارے میں لوگوں کی اکثریت رائے دے، یا جس کے زیادہ ماننے والے ہوں، وہی حق ہے۔ جیسا کہ اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے اور وہ اسی سے استدلال کرتے ہیں؟

قرآن کریم اس غلط پیمانے کو مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے :

"واكثرهم للحق كارهون"

"اور ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرنے والی ہے۔"

(سورہ مومنون ۲۳۔ آیت ۷۰)

ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے :

"وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین"

"اور آپ کسی قدر کیوں نہ چاہیں انسانوں کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے۔" (سورہ یوسف ۱۲۔ آیت ۱۰۳)

خداوند عالم ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

"وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک"

"اور اگر آپ روئے زمین کی اکثریت کی پیروی کریں گے تو یہ آپ کو خدا کے راستے سے بہکا دیں گے۔" (سورہ انعام ۶۔ آیت ۱۱۶)

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں :

"لا تستوحشوا فی طریق الھدی لقلۃ اھلہ"۔

"دیکھو ہدایت کے راستے پر چلنے والوں کی قلت سے گھبرانا نہیں۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۹)

اور اسی طرح آپؑ حضرت ابوذر غفاریؓ کو رخصت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"لا یونسنک الا الحق ولا یوحشنک الا الباطل"

"تمہیں صرف حق سے انسیت ہونی چاہئے اور صرف باطل ہی سے گھبرانا چاہئے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۸)

آیا حق کا پیمانہ عمائدینِ معاشرہ اور بزرگانِ قوم کی رائے ہے؟ اور اس بنیاد پر جب ہم کسی مسئلے میں یا کسی تنازع میں یہ جاننا چاہیں کہ حق کس طرف ہے تو ہمیں اسکے لئے بزرگانِ قوم اور بڑی بڑی شخصیات کی جانب رخ کرنا چاہئے' اور جس چیز کو وہ حق قرار دیں اسی کو حق سمجھنا چاہئے' جس فریق کی جانب ان کا جھکاؤ ہو اسی کو صحیح جاننا چاہئے؟ نہیں یہ پیمانہ بھی درست نہیں' کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ یہ شخصیات

اور بزرگ، حق سے بے خبر یا اس سے پھرے ہوئے ہوں، لٰہذا یہ ہمیں گمراہی اور عذاب کی آگ میں جھونک سکتے ہیں۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ہمارے لئے مجسم کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"یوم تقلب وجوھھم فی النار یقولون یالیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا ○وقالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنافاضلونا السبیلا"

"جس دن ان کے چہرے جہنم کی طرف موڑ دیئے جائیں گے اور یہ کہیں گے کہ اے کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی اور کہیں گے کہ ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔" (سورہ احزاب ۳۳۔ آیت ۶۶، ۶۷)

حضرت علیؑ نے حضراتِ طلحہ، زبیر اور جنابِ عائشہ سے جنگ کے دوران اس تنازع کے حل کے سلسلے میں نہایت کوشش کی، یہ لوگ اصطلاحاً بزرگ اور امت کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے اور ان کے پیروکاروں کے پاس کیونکہ حق کی تشخیص کا کوئی درست معیار نہ تھا، اس لئے وہ ان ہی کو حق کا معیار و پیمانہ سمجھتے تھے۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ "حارث بن حوط" امام علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ کیا آپؑ سمجھتے ہیں کہ میں اصحابِ جمل کو گمراہ مان لوں گا؟ امامؑ نے جواب دیا :

یا حارث انک نظرت تحتک ولم تنظر فوقک فحرت! انک لم تعرف الحق فتعرف من اتاہ، ولم تعرف الباطل فتعرف من اتاہ"

"اے حارث! تم نے نیچے کی طرف دیکھا ہے اور اوپر نہیں دیکھا ہے، اسی لئے حیران و سرگرداں ہو گئے ہو۔ تم حق ہی کو نہیں پہچانتے ہو تو کیا جانو کہ حقدار کون ہے اور باطل ہی کو نہیں جانتے ہو تو کیا جانو کہ باطل پرست کون ہے؟۔" (نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۲۶۲)

کیا حق کا معیار اور پیمانہ ' آباؤ اجداد کی سیرت ہو سکتی ہے؟ اور آنے والی نسل کو اپنے اجداد کی تقلید کرنی چاہئے اور ان کی راہ پر گامزن ہونا چاہئے' جیسا کہ دورِ حاضر کے بہت سے افراد کا یہی وطیرہ ہے؟ مثلاً مسلمان والدین کے یہاں پیدا ہونے والا بچہ از خود مسلمان ہوتا ہے' اور جس مسلک سے اسکے والدین کا تعلق ہوتا ہے وہی وہ بھی اختیار کر لیتا ہے اور جس راستے پر اسکے ماں باپ چلتے ہیں وہ بھی بلاچوں وچرا اسی پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔

یہ معیار بھی درست نہیں اور یہ انسان کے ذہن' عقل اور فکر کو جمود کی جانب لے جاتا ہے۔ قرآن کریم اس قسم کی اندھی اور چشم بستہ تقلید کی مذمت کرتا ہے اور اس قسم کے فکر و خیال کے پیروکار افراد کی تضحیک کرتے ہوئے کہتا ہے :

"انا وجدنا آباءنا علی امۃ و انا علی آثارھم مقتدون ○
قل اولو جئتکم باھدیٰ مما وجدتم علیہ آباءکم۔"

"ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کرنے والے ہیں تو پیغمبر نے کہا کہ چاہے میں اس سے بہتر پیغام لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

(سورہ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۳' ۲۴)

اور اسی بات کی طرف امام علی ابن ابی طالبؑ ہمیں متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ولقد کنا مع رسول اللہؐ نقتل آباءنا وابناءنا واخواننا واعمامنا ما یزیدنا ذلک الا ایمانا و تسلیما"

"ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ہو کر اپنے بزرگوں' بیٹوں' بھائیوں اور چچاؤں کو قتل کرتے تھے' اس سے ہمارے ایمان اور جذبہ ء تسلیم میں اضافہ ہی ہوتا تھا۔" (نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۵۶)

پس اگر اکثریت کی رائے' بزرگوں کی فکر اور آباؤ اجداد کی سیرت حق کا معیار و

پیمانہ نہیں تو پھر کس کسوٹی سے حق کو پہچانا جائے؟

حق کی کسوٹی

دو چیزیں حق کی کسوٹی ہیں :

۱ - **عقل** : یعنی وہ صلاحیت جسے خداوند متعال نے انسان کو سوچنے سمجھنے کے لئے عطا کیا ہے اور جس کی روشنی میں وہ راہِ حق تلاش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ لوگ اپنی عقل استعمال کریں، اور اس کے ذریعے حق تک رسائی کے بارے میں سوچیں۔ اللہ رب العزت قرآن کریم میں فرماتا ہے :

"قل انما اعظکم بواحدة ان تقوموا اللّٰہ مثنی و فردی ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنة ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید"

"آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں صرف اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ کے لئے ایک ایک دودو کر کے اٹھو اور پھر یہ غور کرو کہ تمہارے ساتھی میں کسی طرح کا جنون نہیں ہے۔ وہ صرف آنے والے شدید عذاب کے پیش آنے سے پہلے تمہارا ڈرانے والا ہے۔" (سورہ سبا ۳۴ - آیت ۴۶)

ایک دوسری آیت میں اپنی عظمت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے :

"اولم یتفکروا فی انفسھم ماخلق اللّٰہ السماوات والارض وما بینھما الا بالحق واجل مسمی"

"کیا ان لوگوں نے اپنے اندر فکر نہیں کی ہے کہ خدا نے آسمان و زمین اور اس کے مابین موجود تمام مخلوقات کو برحق ہی پیدا کیا ہے اور ایک معین مدت کے ساتھ۔" (سورہ روم ۳۰ - آیت ۸)

۲ - **وحی** : کیا خداوند عالم نے اپنے بندوں پر حق کے سوا کسی اور چیز کی وحی کی

ہے؟ یا انہیں کوئی باطل حکم دیا ہے؟

انسانوں پر واجب ہے کہ اپنے دلوں میں دین اور اسکی حقیقت کے بارے میں ذرہ برابر شک کو جگہ نہ دیں کیونکہ دین کی حقیقت ایک مسلم امر ہے، کہ جس میں شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا، اس بارے میں ارشاد الٰہی ہے :

"الحق من ربک فلا تکونن من الممترین"

"یہ حق آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے لہٰذا آپ ان شک و شبہ کرنے والوں میں نہ ہو جائیں۔" (سورہ بقرہ ۲ - آیت ۱۴۷)

نیز ارشاد ہے :

"یاایھاالناس قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم"

"اے انسانوں! پروردگار کی طرف سے حق لے کر رسول تمہارے پاس آگیا ہے۔" (سورہ نساء ۴ - آیت ۱۷۰)

امامؑ نے نہج البلاغہ میں متعدد مرتبہ اور بارہا فرمایا ہے کہ خداوند متعال نے رسولِ اسلامؐ کو حق کی جانب لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے مبعوث کیا ہے :

"ثم ان اللہ سبحانہ بعث محمدا (ص) بالحق حین دنا من الدنیا الانقطاع واقبل من الاخرۃ الاطلاع"

"اسکے بعد اللہ نے حضرت محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا جب دنیا فنا کی منزل سے قریب تر ہو گئی اور آخرت سر پر منڈلانے لگی۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۹۶)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

"وان محمدا عبدہ و رسولہ، ارسلہ بامرہ صادعا، وبذکرہ ناطقا فادی امینا و مضی رشیدا، وخلف فینا رایۃ الحق"

"اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں جنہیں اس نے اپنے امر کے

اظہار اور اپنے ذکر کے بیان کے لئے بھیجا' تو انہوں نے نہایت امانت داری کے ساتھ اسکے پیغام کو پہنچا دیا اور راہِ راست پر اس دنیا سے گزر گئے اور ہمارے درمیان ایک پرچمِ حق چھوڑ گئے۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۹۸)

حق اور اسکے پیروکاروں کی تلاش

حق کی جستجو ہر انسان پر لازم ہے اور ضروری ہے کہ تمام انسان ہر مسئلے اور معاملے کے لئے صحیح معیارات اور پیمانوں کے ذریعے حق کے متلاشی رہیں' اگرچہ ان کے لئے حق کی پہچان اور اس تک رسائی انتہائی مشکل ہو' اور خواہ اس سلسلے میں انہیں بہت زیادہ کوشش' مشقت اور جدوجہد ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس بارے میں حضرت علیؑ کا قول ہے۔

"وخص الغمرات للحق حیث کان"

"حق کی خاطر جہاں بھی ہو سختیوں میں کود پڑنا۔" (نہج البلاغہ - مکتوب ۳۱)

کبھی کبھی باطل' حق کے لبادے میں ظاہر ہوتا ہے' خود کو ہر انداز سے آراستہ کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو حالِ حاضر میں ہمیں پریشان کئے ہوئے ہے۔ آج کے دور میں "حق" کے نعرے طرح طرح کی صورتوں میں لگائے جاتے ہیں' مثلاً اتحاد' آزادی' انصاف اور تہذیب کے نعرے۔ بلا شک و شبہ ان نعروں کی اصل اور جوہر حق ہے لیکن جو لوگ بظاہر ان سے وابستگی کا اظہار کر رہے ہیں وہ "حق" کے نام پر اپنے پس پردہ باطل مقاصد کا حصول چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہر انسان کو چاہئے کہ وہ بیدار اور ہوشیار رہے اور کسی صورت میں ان نعروں کے فریب میں نہ آئے۔

حضرت علیؑ نے اس اہم حقیقت (حق کے پردے میں باطل) کی جانب اس وقت انگشت نمائی فرمائی جب آپؑ نے اپنے زمانے میں خوارج کے نعرے "لا حکم الا اللہ" کو سنا۔

کیا کسی میں ہمت تھی کہ اس نعرے پر اعتراض کرتا اور اسے وجہ نزاع قرار دیتا؟ ہاں! صرف علیؑ ابن ابی طالب تھے جنہوں نے اس فتنے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لوگوں پر واضح کیا کہ :

"کلمۃ حق یراد بہا باطل"

"یہ کلمہ حق ہے، لیکن اس سے باطل معنی مراد لئے گئے ہیں۔"

(نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار ۱۹۸)

اور اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز، حق اور باطل کی آمیزش ہے۔ ایسی صورتحال میں لوگ باآسانی فریب اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو مسائل کا گہرا ادراک و شعور رکھتے ہیں، ان کے درمیان تمیز کر سکنے کی قدرت کے مالک ہوتے ہیں اور حق و باطل میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں بعنوانِ مثال کھیل کود کو لے لیجئے۔ جسمانی صحت اور تقویت کے لئے کھیل کود کی ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن آج کل جن کھیلوں کا رواج ہے ان کے لئے اس قدر وقت کی بربادی، ایک باطل اور عبث کام ہے لیکن یہ دونوں باتیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ لہٰذا یہ باطل کھیل لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کی توجہ اپنی سمت مبذول کرا لیتے ہیں۔ امامؑ اس خطرناک چیز سے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"فلو ان الباطل خلص من مزاج الحق لم یخف علی المرتادین، ولو ان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنہ السن المعاندین، ولکن یوخذ من ھذا ضغث ومن ھذا ضغث فیمزجان فھنالک یستولی الشیطان علی اولیائہ وینجو الذین سبقت لھم من اللہ الحسنی"

"اگر باطل میں حق کی آمیزش نہ کی جاتی تو یہ حق کے متلاشی لوگوں سے

پوشیدہ نہ رہتا اور اگر حق باطل کی ملاوٹ سے الگ رہتا تو دشمنوں کی زبانیں کھل نہ سکتی تھیں لیکن ایک حصہ اس (حق) میں سے لے لیا جاتا ہے اور ایک اس (باطل) میں سے' اور پھر دونوں کو ملا دیا جاتا ہے۔ اور ایسے ہی موقع پر شیطان اپنے ساتھیوں پر مسلط ہو جاتا ہے اور صرف وہی لوگ نجات حاصل کر پاتے ہیں جن کے لئے توفیقِ الٰہی اور عنایتِ خداوندی پہلے سے موجود ہو۔" (نہج البلاغہ ۔خطبہ ۵۰)

اسی طرح فرماتے ہیں :

"وانما سمیت الشبهة شبهة لانها تشبه الحق"

"یقیناً شبہ کو شبہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حق سے مشابہ ہوتا ہے۔"

(نہج البلاغہ ۔خطبہ ۳۸)

پس حق کو پہچان لینے کے بعد واجب ہے کہ انسان اسکی پیروی کرے اور اسی کی بنیاد پر اپنے موقف کا چناؤ کرے اور طرز عمل اختیار کرے۔ اگرچہ یہ عمل اسکے ذاتی نفع اور مفادات کے منافی اور اسکی خواہشات اور تمایلات کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات اور تمایلات سے متضاد ہونے کی وجہ سے حق کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز انسان کو حق سے علیحدہ ہونے پر ابھارتی ہے اور وہ حق کے مخالف موقف اپنا لیتا ہے اور اپنی خواہشات اور رجحانات کی پیروی کے لئے باطل کو اختیار کرلیتا ہے۔ اس بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"ان الحق ثقیل مریء' وان الباطل خفیف وبیء"

"حق گراں مگر خوش گوار ہوتا ہے اور باطل آسان مگر وبال ہوتا ہے۔"

(نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار ۳۷۶)

نیز فرماتے ہیں :

"ان افضل الناس عندالله من کان العمل بالحق احب الیه وان نقصه وکرثه من الباطل ' وان جر الیه فائدة و

زادہ"

"یادرکھو کہ پروردگار کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جسے حق پر عمل کرنا (چاہے اس میں اسکا نقصان ہی کیوں نہ ہو) باطل پر عمل کرنے (چاہے اس میں اس کا فائدہ ہی کیوں نہ ہو) سے زیادہ محبوب ہو۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۳)

حق کے حوالے سے ہماری ذمے داری

اب تک کی گفتگو سے یہ نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ حق کے مقابل ہم پر درج ذیل ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں :

۱ - حق کی جستجو : حق کی خاطر جہاں بھی ہو سختیوں میں کود پڑنا۔

۲ - حق کا اتباع : خدا کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے جسے حق پر عمل کرنا باطل پر عمل کرنے سے زیادہ محبوب ہو۔

۳ - حق کے شانہ بشانہ اسکے محاذ پر کھڑے ہونا : جب حق اور باطل کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی ہو تو کسی انسان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ تماش بین کا کردار ادا کرے۔ بلکہ اس پر واجب ہے کہ حق کے طرفدار کی حیثیت سے میدانِ مبارزہ میں اتر جائے۔ بصورتِ دیگر حق کی شکست اور اسکے پچھڑ جانے کی ذمے داری اسکے کاندھوں پر بھی عائد ہو گی۔

ایسے لوگوں کے بارے میں جنھوں نے حق و باطل کی معرکہ آرائی کے دوران گوشہ نشینی اختیار کی اور باطل کے خلاف جنگ سے پرہیز کیا، حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"خذلوا الحق ولم ینصروا الباطل"

"ان لوگوں نے حق کو بھی چھوڑ دیا اور باطل کی بھی مدد نہیں کی۔"

(نہج البلاغہ - کلمات قصار ۱۷)

ایسی صورتِ حال میں اگر باطل کامیاب ہو جائے، تو کیا تماش بین لوگ اس کے فتنے

سے امان میں رہیں گے؟ اور کیا باطل انہیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا کہ وہ آزادی کے ساتھ حق سے جا ملیں؟ ـ ـ ـ نہیں، ہرگز نہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"لو لم تتخاذلوا عن نصر الحق، ولم تهنوا عن توهين الباطل، لم يطمع فيكم من ليس مثلكم، ولم يقو من قوي عليكم"

"اگر تم حق کی مدد کرنے میں کوتاہی نہ کرتے اور باطل کو کمزور بنانے میں سستی کا مظاہرہ نہ کرتے تو تم پر وہ قوم دانت لگائے نہ بیٹھتی جو تم جیسی نہیں ہے اور تم پر یہ لوگ قوی نہ ہو جاتے۔" (نہج البلاغہ ـ خطبہ ۱۶۴)

۴ ـ حق کو زندہ کرنے کی خاطر اس طرح کوشش کرنا کہ انسانوں کی تمام عمر حق کے احیاء اور باطل کی نابودی کے لئے وقف ہو، اس بارے میں امامؑ فرماتے ہیں :

"فلا يكن افضل مانلت فى نفسك من دنياك بلوغ لذة او شفاء غيظ، ولكن اطفاء باطل او احياء حق"

"تمہاری نظر میں دنیا کی سب سے بڑی نعمت کسی لذت کا حصول یا جذبہ انتقام کی تسکین ہی نہ رہ جائے بلکہ بہترین نعمت باطل کے مٹانے اور حق کے زندہ کرنے کو سمجھو۔" (نہج البلاغہ ـ مکتوب ۶۶)

اپنے عہدے اور منصب کو صرف حق کے مقاصد کی ترویج اور نفاذ کے لئے مددگار وسائل سمجھنا چاہئے لیکن اگر عہدہ اور مقام خود مقصد و ہدف میں تبدیل ہو جائے تو انسانیت کے لئے ضرر اور خسارے کا باعث ہو گا۔ عبداللہ ابن عباس کا بیان ہے :

میں مقام ذی قار میں امیرالمومنینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپؑ اپنی جوتی کی مرمت کر رہے تھے۔ آپؑ نے فرمایا :

"ماقيمة هذا النعل؟ فقلت : لا قيمة لها! فقال والله لهى احب الى من امرتكم الا ان اقيم حقا او ادفع باطلا"

"ان جوتیوں کی کیا قیمت ہو گی؟ میں نے عرض کیا : کچھ نہیں!

فرمایا : خدا کی قسم یہ مجھے تمہاری حکومت سے زیادہ عزیز ہیں، مگر یہ کہ حکومت کے ذریعے میں کسی حق کو قائم کر سکوں یا کسی باطل کو دفع کر سکوں۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۳)

نہج البلاغہ کی روشنی میں

آزادی

امیرالمومنینؑ نے حضرت امام حسنؑ کے نام اپنی وصیت میں تحریر فرمایا :

"لاتکن عبد غیرک وقد جعلت اللہ حرا"

"کسی دوسرے کے غلام نہ بنو' کیونکہ اللہ نے تمہیں آزاد خلق کیا ہے۔"

(نہج البلاغہ - مکتوب ۳۱)

کائنات کی عبودیت

اگر ہم اپنے طائرِ فکر کو اس کائنات میں کھلی پرواز کا موقع دیں اور تمام گوشہ و کنارِ عالم اور اس میں پائی جانے والی مخلوقات کے بارے میں غور و فکر کریں' تو باآسانی دریافت کرلیں گے کہ اس کائنات کے معمولی ترین ذرے سے لے کر عظیم ترین کہکشاں تک ایک جبری حرکت کے تابع ہے' ایک ایسی حرکت جو گویا ان پر فرض اور واجب کر دی گئی ہے۔

پس اللہ رب العزت جس نے حیات اور کائنات کو خلق کیا ہے' اس نے ہر ذرے اور ہر حرکت کے لئے ایک معین کردار اور خاص وظیفے کا تعین بھی کیا ہے اور ان میں سے کسی کو بھی اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں۔ اسی بنا پر آسمان اور زمین جو ایک

معین نظام کے حامل ہیں اس نظم کی پابندی یا اس سے روگردانی کا اختیار نہیں رکھتے۔
اس بارے میں خداوند منان فرماتا ہے :

"ثم استوی الی السماء وھی دخان فقال لھا وللارض
ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین"

"اسکے بعد اس نے آسمان کا رخ کیا جو بالکل دھواں تھا اور اسے اور زمین
کو حکم دیا کہ بخوشی یا چارونا چار ہماری طرف آؤ' تو دونوں نے عرض کی کہ
ہم اطاعت گزار بن کر حاضر ہیں۔" (سورہ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۱)

نیز چاند اور سورج بھی قطعی اور اٹل قوانین کے پابند ہیں اور وہ کسی بھی صورت
میں ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ اس بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے :

"والشمس تجری لمستقر لھا ذٰلک تقدیر العزیز
العلیم۝ والقمر قدرنٰہ منازل حتی عاد کالعرجون
القدیم۝ لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل
سابق النھار وکل فی فلک یسبحون"

"اور آفتاب اپنے ایک مرکز پر دوڑ رہا ہے کہ یہ خدائے عزیز و علیم کی
معین کی ہوئی حرکت ہے اور چاند کے لئے بھی ہم نے منزلیں معین کردی
ہیں یہاں تک کہ وہ آخر میں پلٹ کر کھجور کی سوکھی ٹہنی جیسا ہو جاتا ہے۔
نہ آفتاب کے بس میں ہے کہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات کے لئے ممکن
ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے۔ اور یہ سب کے سب اپنے اپنے فلک
اور مدار میں تیرتے ہیں۔" (سورہ یٰسین ۳۶۔ آیت ۳۸ تا ۴۰)

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے :

"الا وان الارض التی تقلکم والسماء التی تظلکم
مطیعتان لربکم' وما اصبحتا تجودان لکم ببرکتھما
توجعا لکم' ولا زلفۃ الیکم' ولا لخیر ترجوانہ منکم'

ولکن امرتا بمنا فعکم فاطاعنا، واقیمتا علی حدود مصالحکم فقامتا"

"یاد رکھو کہ جو زمین تمہارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور جو آسمان تمہارے سروں پر سایہ کئے ہوئے ہے' دونوں تمہارے رب کے اطاعت گزار ہیں اور یہ جو اپنی برکتیں تمہیں عطا کر رہے ہیں تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کا دل تمہارے حال پر کڑھ رہا ہے' یا یہ تمہارا تقرب چاہتے ہیں' یا تم سے کسی بھلائی کے امیدوار ہیں' بلکہ یہ تمہارے لئے منفعت رسانی پر مامور ہیں۔ اور اپنی اس ڈیوٹی کو ادا کر رہے ہیں اور تمہاری مصلحتوں کی حدوں پر انہیں ٹھہرایا گیا ہے' چنانچہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۴۱)

حد یہ ہے کہ حیوانات بھی کچھ جبلی (Instinct) میلانات کے تابع اور فرمانبردار ہیں' جو خداوندِ تبارک و تعالیٰ کے حکم سے ایک مقصد و ہدف تک پہنچنے کے لئے ان پر واجب اور فرض کئے گئے ہیں۔ لہٰذا حیوانات ان جبلتوں (Instincts) کی بنیاد پر اپنی زندگی اور طور طریقوں میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ مثلاً شہد کی مکھی' جب سے انسان نے اسے دیکھا ہے اس وقت سے اب تک اپنی زندگی میں ایک خاص اور محدود اسلوب اور طریقے کی پیروی میں مشغول ہے' جس میں قیامت تک کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو گی۔ اور یہی معاملہ چیونٹیوں اور دوسرے حشرات اور حیوانات کا ہے جو ایک جبری اور نظامِ کائنات سے ہم آہنگ حرکت میں مصروف ہیں۔

انسان کی آزادی

لیکن انسان' اپنے جسمانی اور روحانی پہلوؤں کی بنا پر کائنات کے دوسرے تمام اجزاء سے مختلف اور ممتاز ہے' البتہ وہ مادی پہلو سے دوسرے تمام مخلوقاتِ عالم ہی کی مانند ہے۔ کیونکہ اس جہت سے وہ بھی دوسرے موجودات کی طرح ایک جبری نظام کا پابند

اور فرمانبردار ہے اور اس سلسلے میں کسی ارادے اور اختیار کا مالک نہیں ہے۔ وہ اپنے والدین، پیدائش کے وقت اور اپنی شکل وصورت اور جنس کا انتخاب اپنے ارادے اور خواہش سے نہیں کر سکتا۔ اپنے فزیالوجیکل نظام، اپنے بدن اور جسم میں دخل اندازی اور تصرف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہ اپنے جسم کے اندرونی نظام اور حرکات و افعال، جیسے خون کے ذرات، گردے، جگر وغیرہ میں کسی قسم کی تبدیلی اور ردوبدل پر قادر نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی انسان کے ارادے اور اختیار کی حدود میں نہیں۔

البتہ انسان اپنے دوسرے پہلو کے لحاظ سے تمام حیوانات اور کائنات میں موجود مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ دوسری مخلوقات کی مانند صرف مادی اشیاء کا ایک مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس کے علاوہ خداوند عالم کی طرف سے پھونکی ہوئی روح کا بھی حامل ہے، جو اسے برتری اور فضیلت بخشتی ہے۔ اس بارے میں خداوند منان کا ارشاد ہے :

"اذقال ربک للملائکۃانی خالق بشرا من طین ○ فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین"

"انہیں یاد دلایئے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں گیلی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ جب اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب (میرے حکم سے) سجدہ میں گر جانا۔"

(سورہ ص ۳۸۔ آیت ۷۱، ۷۲)

نیز حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"ثم جمع سبحانہ من حزن الارض وسہلہا، وعذبہا وسبخہا، تربۃ سنہا بالماء حتی خلصت، ولاطہا بالبلۃ حتی لزبت، فجبل منہا صورۃ ذات احناء ووصول، واعضاء وفصول اجمدہا حتی استمسکت واصلدہا حتیٰ صلصلت لوقت معدود، وامد معلوم، ثم نفخ فیہا من روحہ فمثلت انسانا ذا اذہان یجیلہا،

وفکر یتصرف بھا، وجوارح یختدمھا، وادوات یقلبھا، ومعرفۃ یفرق بھا بین الحق والباطل"

"اس کے بعد پروردگار نے زمین کے سخت و نرم اور شور و شیریں حصوں سے خاک کو جمع کیا اور اسے پانی سے اس قدر بھگویا کہ بالکل خالص ہو گئی اور پھر تری میں اس قدر گوندھا کہ لیسدار بن گئی اور اس سے ایک ایسی صورت بنائی جس میں موڑ بھی تھے اور جوڑ بھی، اعضاء بھی تھے اور جوڑ بند بھی۔ پھر اسے اس قدر سکھایا کہ مضبوط ہو گئی اور اس قدر سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی۔ ایک وقتِ معین اور مدتِ معلوم تک اسے یونہی رہنے دیا۔ پھر اس میں روح پھونکی اور اسے ایسا انسان بنا دیا جس میں ذہن کی جولانیاں بھی تھیں اور فکر کے تصرفات بھی، کام کرنے والے اعضاء وجوارح بھی تھے اور حرکت کرنے والے ادوات و آلات بھی اور حق و باطل میں فرق کرنے والی معرفت بھی تھی۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱)

اس الٰہی روح کی بنا پر انسان، دوسری تمام موجودات سے برتر و افضل ہے۔ اس الٰہی روح کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ارادہ اور تفکر ہے۔ پس اگر انسان اپنے اعمال و کردار میں جبر و قہر کا تابع ہو تو پھر اسے حاصل غور و فکر کی صلاحیت اور ارادہ کس مقصد کے لئے ہے؟

تفکر اور سوچ سمجھ وہاں موثر ہے جہاں اختیار حاصل ہو

خداوند منان نے انسانوں کو عمل کی آزادی اور غور و فکر کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم تمام عالمِ ہستی اور موجودات کی عبودیت اور خداوند سبحان کے فرامین کے سامنے ان کے سرِ تسلیم خم ہو جانے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان بے شمار انسانوں کے جو خدا کی عبودیت سے روگرداں ہیں اور فرامینِ الٰہی کے سامنے گردن نہیں جھکاتے اس جبر و قہر سے استثنا کی جانب اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے :

"الم تران اللہ یسجد له من فی السماوات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس وکثیر حق علیه العذاب"

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے اور آفتاب وماہتاب اور ستارے، پہاڑ، درخت، چوپائے اور انسانوں کی ایک کثیر تعداد، سب ہی (کمالِ شوق کے ساتھ) اللہ کے لئے سجدہ گزار ہیں اور ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو (نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے) مستوجبِ عذابِ حق ہیں۔" (سورہ حج ۲۲۔ آیت ۱۸)

حق خداوند عالم نے اپنی تمام تر قدرت اور توانائی کے باوجود اپنے اوپر ایمان اور اپنی وحدانیت اور وجود کے اعتراف کے سلسلے میں انسانوں پر جبر و قہر نہیں کیا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں انسان مکمل آزادی سے بہرہ مند ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے :

"ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلهم جمیعا"

"اور اگر خدا چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب ایمان لے آتے۔"

(سورہ یونس ۱۰۔ آیت ۹۹)

اسی طرح فرماتا ہے :

"اناھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا"

"یقیناً ہم نے اسے راستے کی ہدایت دے دی ہے۔ چاہے تو وہ (ہدایت قبول کرے اور اس نعمت پر) شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کرنے والا ہو جائے۔" (سورہ انسان ۷۶ - آیت ۳)

قضا وقدر

بہت سے لوگ بعض اسلامی اصطلاحات اور دینی معارف کے سلسلے میں مغالطوں سے دوچار ہیں اور آیاتِ قرآنی اور رسولؐ اور ان کے اہل بیتؑ کی احادیث کی تاویل

میں خطا اور غلطی کے شکار ہیں۔ ایسی ہی اصطلاحات میں قضاوقدر کی اصطلاح اور آیاتِ ضلالت اور ہدایت شامل ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ قضاوقدر کے معنی انسان کے اختیار اور آزادی کو محدود کرنا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ انسان کے بارے میں جبر اور قہر کے قائل ہیں۔

ہم اس گفتگو میں قضاوقدر کی بحث کی گہرائیوں میں نہیں جانا چاہتے بلکہ صرف اس جانب اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ آیات قرآنی اور ان کے مفاہیم تمام کے تمام ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور آیات کے درمیان کسی قسم کا اختلاف اور تضاد نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا جب کبھی ہمیں آیات قرآنی میں تضاد و تناقض محسوس ہو تو اسے ہمیں خود اپنے فکر و فہم کی کوتاہی سمجھنا چاہئے اور اسے قرآنی مسائل کی صحیح شناخت سے اپنی عاجزی اور عدم ادارک کا نتیجہ قرار دینا چاہئے، نہ کہ قرآن کریم میں (نعوذباللہ) نقص کے قائل ہو بیٹھیں۔

شام سے تعلق رکھنے والا ایک شخص امام علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؑ سے سوال کیا : کیا شام کی جانب ہمارا سفر قضاوقدر کی بنیاد پر تھا؟

حضرتؑ کو اس کے سوال سے اندازہ ہوگیا کہ یہ شخص قضاوقدر کے مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہے اور اس کا خیال ہے کہ یہ ایک طرح کا جبر ہے اور انسان کی آزادی کو محدود کرنا ہے۔ پس آپؑ نے تفصیل کے ساتھ اسے جواب دیا :

"ویحک! لعلک ظننت قضاءً لازماً، وقدراً حاتماً! ولو کان ذٰلک کذٰلک لبطل الثواب والعقاب وسقط الوعد والوعید، ان اللہ سبحانہ امر عبادہ تخیراً ونھاھم تحذیراً، وکلف یسیراً، ولم یکلف عسیراً"

"شاید تیرا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد قضاء لازم اور قدرِ حتمی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر نہ ثواب کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی عذاب کا، نہ وعدے کے کچھ معنی رہتے ہیں اور نہ ہی وعید کے (ایسا ہرگز نہیں

ہے) خداوند عالم نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے اور اختیار بھی اور نہی کی ہے تو (عذاب سے) ڈراتے ہوئے۔ اور اس نے سہل اور آسان تکلیف دی ہے اور دشواریوں سے بچائے رکھا ہے۔"

(نہج البلاغہ - کلمات قصار ۷۸)

وراثت اور تربیت

جدید علم انسان کے لئے نہ صرف اسکے قد کاٹھ، اسکی شکل و صورت میں وراثت کے اثرات کا قائل ہے، بلکہ انسانی طرز عمل اور اعمال وافعال میں بھی موروثی اثرات کو قبول کرتا ہے۔ لہٰذا یہ انسانی ذات کی تشکیل میں تربیت کے کردار کو کم اہمیت دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی تربیت کے سلسلے میں انسان کی جد و جہد محدود ہو گئی ہے۔

جدید علم کے یہ انکشافات مذہب کے لئے کوئی نئی حقیقت نہیں ہیں۔ دین شروع ہی سے انسان کی زندگی میں وراثت اور تربیت کے اثرات کا قائل ہے۔ تاہم اس حد تک کہ انسان کی آزادی اور اسکا اختیار سلب نہ ہو۔ لہٰذا تربیت اور وراثت کے عامل اس رفتار و کردار کی جانب انسان کے صرف میلان کے عوامل ہیں جسے انسان اپنی زندگی میں اپنانا چاہتا ہے۔ لیکن آخری فیصلہ خود انسان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنے والدین کے طور طریقوں اور معاشرے کے رسم و رواج کے مطابق بھی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اس بات کی قدرت بھی رکھتا ہے کہ ان کے بر خلاف راستہ اختیار کرے اور ایک بالکل نئی راہ کا انتخاب کرے۔

خدا کے ایک پیغمبر حضرت نوحؑ کے بیٹے نے وراثت میں اپنے والد سے ایمان اخذ نہیں کیا اور ان کے عقائد اختیار نہ کئے۔ اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے :

"ونادی نوح ابنه وکان فی معزل یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین ○ قال ساوی الی جبل یعصمنی من الماء قال لا عاصم الیوم من امر الله الا من رحم وحال

بینهما الموج فکان من المغرقین"

"اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی جو الگ جگہ پر تھا کہ بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا (تاکہ نجات پاجائے) اور کافروں کے ساتھ نہ ہوجا (کہ ہلاک ہوجائے گا) اس نے کہا کہ میں عنقریب پہاڑ پر پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ نوح نے کہا کہ آج حکمِ خدا سے کوئی بچانے والا نہیں ہے سوائے اسکے جس پر خود خدا رحم کرے، اور پھر دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ کافروں کے ساتھ غرق ہو گیا۔" (سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۴۲، ۴۳)

تاریخ میں کثرت کے ساتھ ایسی مثالیں اور نمونے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان آزاد ہے اور اپنے گھرانے کے عقائد وعادات اور اپنے معاشرے کی رسوم ورواج سے بغاوت کرسکتا ہے۔ اس کا ایک نمایاں نمونہ حضرت مصعب بن عمیر ہیں، جو زمانۂ جاہلیت کے عیش کوش گھرانوں میں سے ایک گھر میں پیدا ہوئے اور اپنے گھرانے کی جاہلیت پر مبنی اور پر تعیش زندگی سے بغاوت کی اور اسلام کے پرچم تلے کمزور وناتواں افراد اور غلاموں سے آملے۔

اسی طرح دنیائے معاصر میں بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جو عیش کوش سرمایہ داروں کے گھروں میں پیدا ہوئے، اور بورژواری تربیت اور استکباری ماحول میں پروان چڑھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے ماحول سے سرکشی کی اور اسکے خلاف انقلاب وجود میں لائے اور انقلابیوں اور مجاہدینِ راہ خدا کی جماعتوں میں شامل ہوئے۔

آزادی کے مظاہر

جس طرح خداوند منان نے انسان کو آزاد خلق کیا ہے، اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان آزادانہ زندگی بسر کرے اور اپنے ارادے اور اختیار سے عمل کرے۔ خداوند عالم نے کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ دوسروں کے ارادے و

اختیار کو سلب کرے' یا یہ کہ دوسروں کی آزادانہ کوششوں کے سامنے رکاوٹ بنے۔ آسمانی ادیان بھی انسانوں کے لئے آزادی کے قائل رہے ہیں اور اسکی حفاظت اور حمایت کرتے ہیں۔

وہ امور جن میں اسلام انسان کو آزادی کا حامل سمجھتا ہے اور اس سے استفادے کی توانائی دیتا ہے' درج ذیل ہیں۔

۱ : فکر اور عقیدے کی آزادی

اسلام انسانوں پر بالجبر اور زبردستی کسی عقیدے کو ٹھونسنا درست نہیں سمجھتا۔

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا واللہ سمیع علیم"

"دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے۔ اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اسکی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے اور خدا سمیع بھی ہے اور علیم بھی۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶)

ایک اور مقام پر ارشاد الٰہی ہے :

"افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین"

"تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں۔"

(سورہ یونس ۱۰۔ آیت ۹۹)

ایک اور جگہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

"فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر"

"اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو

جائے۔" (سورہ کہف ۱۸۔ آیت ۲۹)

اسلام اور اسلامی احکام کے سائے میں یہود ونصاریٰ اپنے دین اور عقائد پر باقی رہتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں اور اہلِ ایمان اسلامی عقیدے کے ان اساسی اصولوں کے سوا جن کی رعایت ہر مومن انسان پر لازم ہے مکمل ارادے اور آزادی کے حامل اور اس سے بہرہ مند ہیں۔ اور یہ آزادی اس وقت تک محترم ہے جب تک اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم نہ ہو۔ مثال کے طور پر "عالمِ ذر" کی معروف تفاصیل کے بارے میں انسان آزاد ہے چاہے تو ان پر ایمان رکھے اور چاہے تو ان پر یقین نہ رکھے(ا)۔ جو چیز جہاں تک اسکے لئے مسلم ہو اور وہ جس حد تک اسکی صحت پر یقین واعتماد رکھتا ہو وہاں تک اس پر ایمان لائے اور جہاں اسے یقین نہ ہو تو وہاں کوئی جبر نہیں اور اس سے سوال نہ ہوگا۔

نیز طبیعی اور قدرتی علمی مسائل کو انسانی فکر و شعور پر چھوڑا گیا ہے اور اس بارے میں کسی قسم کا جبرواکراہ نہیں، مثلاً زمین کی حرکت یا سورج کی گردش وغیرہ جیسی چیزوں پر اعتقاد اوران مسائل کے بارے میں کوئی رائے رکھنے پر کسی قسم کا اجبار نہیں اور ہمارا یہ نظریہ قرونِ وسطیٰ کے عیسائی کلیسا کے برخلاف ہے کہ جس نے اس دور میں اپنے رجعت پسندانہ نظریات کو عیسائی معاشرے پر ٹھونسنے کی کوشش کی اور اس بارے میں جو کوئی بھی عیسائی کلیسا کے عقائد کی مخالفت کرتا اسے یہ لوگ کافر قرار دے کر قتل کردیتے۔

۲ : بیان اور تنقید کی آزادی

اسلام کی عنایات کے سائے میں، انسان کو حسبِ دلخواہ اپنی رائے کے اظہار کا حق

ا ۔ محترم مصنف کی مراد "عالمِ ذر" کی ماہیت سے نہیں جو ایک مسلم قرآنی اصول ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ "عالمِ ذر" کی تفاصیل اور اسکی مختلف تفاسیر کے بارے میں اختلافِ نظر اور مختلف خیالات کو مسترد یا قبول کیا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

حاصل ہے اور جس چیز کو وہ انحراف سمجھتا ہو اس کی مخالفت کا بھی حق رکھتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے اپنی اس آزادی سے تعجب انگیز حد تک اور انتہائی جرات کے ساتھ استفادہ کیا۔ اس دور میں ایک معمولی شخص بھی خلیفہ پر تنقید اور اس سے بحث وجدل کرتا تھا' یہاں تک کہ ایک عام عورت بھی خلیفہء وقت کے فیصلے پر اعتراض کرتی تھی اور اسے پیچھے ہٹنے اور اپنے فیصلے کو بدل دینے پر مجبور کردیتی تھی۔

حضرت عمر نے ایک ایسے قانون کی تصویب کی جس کے تحت عورتوں کا مہر محدود کیا جانا قرار پایا۔ یہ جاننے کے بعد ایک عورت نے خلیفہ کے اس فیصلے پر اعتراض کیا اور سند کے طور پر درج ذیل آیت پیش کی۔

"وان اردتم استبدال زوج مکان زوج وءاتیتم احدٰھن قنطارا۔"

"اگر تم ایک زوجہ کی جگہ دوسری زوجہ کو لانا چاہو اور ایک کو کثیر مال بھی دے چکے ہو تو خبردار اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔"

(سورہ نساء ۴۔ آیت ۲۰)

اس دلیل کی روشنی میں خلیفہ کے لئے اپنی خطا کا اعتراف ناگزیر ہوگیا اور انہوں نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور اسی موقع پر وہ معروف جملہ کہا کہ : "اصابت امراۃ واخطاء عمر" (ایک عورت نے درست بات کی اور عمر نے خطا اور غلطی کی)۔

اسی طرح ایک عورت حضرت علیؑ کی خلافت کے زمانے میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپؑ کے ایک اہلکار کی شکایت کی۔ امیرالمومنینؑ نے اس عورت کی شکایت کو بہت اہمیت دی اور اس شکایت کی وجہ سے اس اہلکار کی معزولی کا حکم صادر فرمایا۔

اس چیز کے مظاہر ہم رسول کریمؐ اور دیگر معصومینؑ کی زندگیوں میں بھی دیکھتے ہیں۔ آپ حضراتؑ دوسروں کو اپنی رائے اور عقیدے کے اظہار کا موقع دیا کرتے تھے اور لوگ انتہائی آزادی کے ساتھ آپ کے سامنے گفتگو کرتے تھے۔ اگر ان کے نظریات

اور آراء ائمہؑ کی رائے کے مخالف ہوتیں تو ائمہؑ انہیں سمجھاتے اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک دیہاتی عرب آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ وہ آپؐ کی خدمت میں اپنی رائے عرض کرنا چاہتا تھا لیکن بات شروع کرنے سے پہلے ہی اس پر خوف مسلط ہوگیا اور اسکی زبان لڑکھڑانے لگی۔ یہ دیکھ کر رسول کریمؐ نے فرمایا : خوف نہ کھاؤ مطمئن رہو، میں اسی نادار اور خشک روٹی کھانے والی عورت کا بیٹا ہوں۔

جب امت اسلامیہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کی تو چند اصحاب رسول جیسے عبداللہ ابن عمر نے حضرت علیؑ کی بیعت سے اجتناب کیا۔ حضرت علیؑ کے بعض اصحاب نے مشورہ دیا کہ آپؑ بالجبر اور طاقت کے زور پر اس سے بیعت لیں لیکن امیرالمومنینؑ نے اس تجویز کو مسترد کردیا۔

جب امام حسن علیہ اسلام نے معاویہ سے صلح کی تو آپؑ کو اپنے بہت سے اصحاب کی طرف سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا، ان ہی میں سے ایک "حجر بن عدی" امام حسنؑ کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ سلام ہو آپؑ پر اے مومنین کو ذلیل کرنے والے! اے کاش آپ مرجاتے اور معاویہ سے صلح نہ کرتے۔ امام حسنؑ نے فراخ دلی اور خوشروئی کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان وجوہات کو بیان کیا جو صلاح کا موجب بنیں اور انہیں مطمئن کردیا۔

۳ : کردار و عمل کی آزادی

اسلام نے انسان کو کردار و عمل کی مکمل آزادی دی ہے، وہ جیسا چاہے طرز عمل اختیار کرے، انفرادی ملکیت، تجارتی معاملات اور معاشرتی سرگرمیوں کے سلسلے میں اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی بشرطیکہ اسکا کردار و عمل دوسروں کے حقوق اور آزادی پر تجاوز اور تعدی کا موجب نہ ہو یا اسلامی معاشرے کے لیے ضرر رساں نہ بنے۔

پھر یہ پابندیاں اور سزائیں کیوں ہیں؟

آپ میں سے بعض دوستوں کے ذہن میں لازماً یہ سوال آئے گا کہ پھر ان پابندیوں کا کیا مقصد ہے اور زنا' شراب نوشی اور چوری وغیرہ جیسے جرائم کے لیے اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ کیوں ہیں؟ کیا یہ انسان کی آزادی اور اسکے ارادے اور اختیار کو محدود کردینا نہیں؟

پہلا جواب : وہ محرمات جنہیں خداوندعالم نے انسان پر حرام کیا ہے' ان سے منع کر کے در حقیقت اس نے ان کے ضرر رساں ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے اور ان چیزوں سے پرہیز کے حکم میں صرف انسان کی فلاح اور بہبود پیش نظر ہے اور خداوندعالم کسی عنوان اور کسی حالت میں انسان کو خود اپنے آپ کو آزار پہنچانے اور مشقت میں ڈالنے کی اجازت نہیں دیتا۔

"ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة۔"

"اور اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۵)

دوسرا جواب : اکثر ان جرائم کے اثرات خود انسان کے اپنے دائرے اور حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور دوسروں کو متاثر کرنے لگتے ہیں اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور ان کی آزادی کو سلب کرنے پر منتج ہوتے ہیں۔ مثلاً چوری دوسروں پر ظلم اور تجاوز ہے اور زنا' لواط' شراب نوشی وغیرہ جیسے جرائم کا نتیجہ بھی اسی قسم کا ہے۔ اسلام انسانوں کو دوسروں کے حقوق' آسائش اور آزادی میں مداخلت کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

تیسرا جواب : جن چیزوں کا انسانوں کو پابند کیا گیا ہے ان کی خلاف ورزی پر ان کا مواخذہ ان کی آزادی پر قدغن لگانا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آپ مجھ سے ملاقات کرنے اور مجھ سے ملنے کے لئے آنے کے سلسلے میں آزاد ہیں لیکن اگر آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ میں فلاں وقت پر آپ سے ملاقات کے لئے آؤں گا' اور مقررہ وقت پر آپ نہ

آئیں، میں آپ کا انتظار کرتا رہوں اور آپ اپنے وعدے پر عمل نہ کریں۔ پھر کچھ دن بعد جب میری آپ سے ملاقات ہو تو کیا میں آپ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتا کہ بھائی آپ نے مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا، آپ اس روز کیوں تشریف نہ لائے؟ اور میرے پوچھنے پر کیا آپ کا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں آزاد انسان ہوں، میری مرضی میں آؤں یا نہ آؤں۔۔۔ یہ درست ہے کہ آپ آزاد ہیں لیکن اس موقع پر آپ نے وعدہ کیا ہے اور خود کو پابند کیا ہے کہ وقتِ مقررہ پر مجھ سے ملاقات کے لئے آئیں گے لہٰذا آپ کے لئے اپنے اس وعدے پر عمل لازم ہے۔

ایک اور مثال پیش خدمت ہے۔ رنگ و روغن کرنے والا ایک کاریگر جو مارکیٹ میں بیٹھا ہے آزاد ہے، چاہے تو آپ کے گھر رنگ کرے چاہے تو نہ کرے لیکن جوں ہی وہ آپ سے آپ کے گھر رنگ کرنے کا معاہدہ کرتا ہے، آپ کا پابند ہو جاتا ہے۔ اب اس نے اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ خود کو آپ کے گھر پر رنگ کرنے کا پابند کیا ہے۔

یہی صورت اس وقت ہوتی ہے جب انسان اسلام اور اسکے قوانین پر ایمان لاتا ہے۔ اس موقع پر درحقیقت وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ اب آئندہ اسلامی نظام اور اسکے قوانین کا پابند رہے گا۔ اب گویا وہ ایک ایسی قرارداد پر دستخط کرتا ہے جس میں تحریر ہے کہ اسلام کے واجب کئے ہوئے اعمال کی پیروی کرے گا اور اسکی حرام کی ہوئی چیزوں سے اجتناب کرے گا۔

اب جب کہ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے دینِ اسلام کا انتخاب کیا ہے، کسی بیرونی قوت نے اس پر دینِ اسلام مسلط نہیں کیا ہے بلکہ اس نے مکمل آزادی کے ساتھ اسلام کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کو قبول کیا ہے، تو اس صورت میں اسلامی احکام و قوانین کی پابندی کی ذمے داری اسکے اپنے کاندھوں پر ہے۔ پس اگر وہ ان قوانین کی مخالفت کرے اور مثلاً شراب نوشی کرے یا زنا کا مرتکب ہو تو معاہدہ توڑنے پر اسکا مواخذہ ہوگا اور اسے بازپرس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تاہم کیا اسلام شراب نوشی یا روزہ ترک کرنے وغیرہ جیسی چیزوں پر ایک عیسائی کا

مواخذہ کرے گا؟یا ایک مجوسی کا اپنے محارم سے نکاح کرنے پر مواخذہ کرے گا؟

قدرتی بات ہے کہ جب تک وہ اسلام قبول نہ کرلیں اسوقت تک اس دنیا میں ان سے کوئی حساب نہیں لیا جاسکتا اور نہ انہیں نامناسب باتوں پر کوئی سزا دی جاسکتی ہے لیکن آخرت، روزِقیامت اور دوسری دنیا میں حساب کتاب ایک علیحدہ موضوع ہے(۱)۔

انسان کس طرح غلام بنتا ہے

خداوندعالم نے انسان کو آزاد خلق کیا ہے اور اس نے انبیاء بھیج کر اور ان کے ذریعے اپنے قوانین بیان کرکے اس دنیا میں انسان کی آزادی کی ضمانت فراہم کی ہے۔ یہ جان لینے کے بعد سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کون ہے جو انسان سے آزادی چھینتا ہے؟ کون ہے جو غیرخدا کی بندگی کا طوق اس کی گردن میں ڈالتا ہے؟ اور دین بالخصوص نہج البلاغہ کا موقف اس بارے میں کیا ہے کہ کس نے انسان کی آزادی کو سلب کیا ہے؟

۱ : غرائز اور دنیوی خواہشات

حیوانی غرائز اور خواہشات (Insticts) انسان کو ان چیزوں کی طرف کھینچتی ہیں جو اسکی عقل اور ضمیر کے بر خلاف ہوتی ہیں۔ پس ایک ایسا انسان جو ان غرائز اور خواہشات سے مقابلے کی جرات نہ رکھتا ہو وہ ان کے زیراثر آجاتا ہے اور اپنی آزادی سے دستبردار ہوکر ان کے سامنے تسلیم اور ان کا فرمانبردار ہوجاتا ہے۔ اس حال میں وہ اپنی غرائز اور شیطانی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے شر کے شکنجے سے نجات کے قابل نہیں رہتا۔ اس بارے میں حضرت علی فرماتے ہیں :

---

۱ - یہ نظریہ جسے محترم مصنف نے پیش کیا ہے اس زمانے سے مربوط ہے جب کسی خطے میں اسلامی حکومت قائم نہ ہو لیکن اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے تو وہاں مذہبی اقلیتوں پر اسلامی قوانین کی پابندی لازم ہے جو جزیہ کی ادائیگی، فساد نہ پھیلانا اور جو کچھ اسلامی قوانین کے خلاف ہے اسکا اظہار نہ کرنا ہے (مترجم)۔

"وکذٰلک من عظمت الدنیا فی عینه (یعنی شهوات الدنیا) وکبر موقعها فی قلبه آثرها علی اللّٰه تعالٰی فانقطع الیها، وصار عبدالها"

"یہی حال اس شخص کا بھی ہے جس کی نظر میں دنیا عظیم اور با اہمیت ہوتی ہے اور اسکے دل میں اسکی عظمت اور وقعت بڑھ جاتی ہے تو وہ (اس) دنیا کو اللہ پر ترجیح دیتا ہے، اسی کی طرف رخ کرلیتا ہے اور اسی کا غلام ہو کے رہ جاتا ہے" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۵۸)

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

"قد خرقت الشهوات عقله، واماتت الدنیا قلبه، و ولهت علیها نفسه، فهو عبد لها، ولمن فی یدیه شیء منها، حیثما زالت زال الیها، وحیثما اقبلت اقبل علیها"

"خواہشات نے اسکی عقل کو پارہ پارہ کردیا ہے اور دنیا نے اسکا دل مردہ بنادیا ہے، وہ اس پر مرمٹا ہے۔ یہ دنیا کا اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھوڑی سی بھی دنیا ہے ان کا بندہ اور غلام بن گیا ہے، جس طرف وہ مڑتی ہے اسی طرف یہ مڑتا ہے، جس طرف اسکا رخ ہوتا ہے اسی طرف اسکا رخ ہوجاتا ہے۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۷)

۲ : اندھی تقلید

دوسروں کی دیکھا دیکھی بغیر سوچے سمجھے ان کے کاموں کی پیروی کرنا اندھی تقلید کہلاتی ہے۔ جب انسان اپنے اردگرد لوگوں، معاشرے کے سرکردہ افراد اور سرداروں کو کسی رسم کا پابند دیکھتا ہے، کسی عقیدے کا معتقد پاتا ہے اور بلا تحقیق اور اپنی آزادی اور اختیار سے استفادہ کئے بغیر ان کے اس عقیدے اور راہ و رسم کو اپنا لیتا ہے، تو اس

طرح دراصل وہ اپنے معاشرے اور بزرگوں کی اندھی تقلید کا مرتکب ہوتا ہے۔ امیرالمومنینؑ ایسے لوگوں کو انتباہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"الا فالحذر الحذر من طاعة ساداتکم و کبرائکم"

"دیکھو اپنے سرداروں اور بڑوں کی اتباع سے محتاط رہو۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۹۰)

۳ : دوسروں کا تسلط اور ان کی طاقت

بسا اوقات دوسروں کا تسلط انسان کو اپنی آزادی اور اختیار سے فائدہ اٹھانے سے روک دیتا ہے اور صاحبِ قدرت افراد اپنی آراء وافکار اور اپنے وضع کردہ اصول و قوانین اس پر مسلط کردیتے ہیں۔ اسلام اس مشکل کے حل کے لیے دو طریقے اختیار کرتا ہے۔

☆ ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ استبداد کرنے والے، دوسروں پر اپنا تسلط قائم کرنے والے اور انہیں اپنا غلام بنانے والے کو اس روش سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

☆ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ استبداد کا شکار اور ذلت وخواری سے دو چار افراد کو آزادی اور خود مختاری کے حصول کے لئے جدوجہد اور کوشش پر ابھارتا ہے اور انہیں ظالموں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے اور ان کی غلامی قبول کرنے [illegible] کے ساتھ ممانعت کرتا ہے۔

دوسروں پر جبر و تسلط کی مذمت کرتے ہوئے احادیث میں آیا ہے :

"شر الناس من احترم مخافة شره"

"بد ترین انسان وہ شخص ہے جس کے شر اور خوف کی وجہ سے اسکا احترام کیا جائے۔"

اس بارے میں امیرالمومنینؑ نے مالک اشترؒ کو تحریر کیا :

"واشعر قلبک الرحمة للرعية والمحبة لهم، واللطف

بھم، ولا تکونن علیھم سبعا ضاریا تغتنم اکلھم فانھم صنفان : اما اخ لک فی الدین او نظیر لک فی الخلق"

"رعایا کے ساتھ مہربانی اور محبت و رحمت کو اپنے دل میں جگہ دو اور خبردار ان کے حق میں پھاڑ کھانے والے درندے کی مثل نہ ہو جانا کہ انھیں کھا جانے ہی کو غنیمت سمجھنے لگو۔ اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسرے خلقت میں تم جیسے بشر ہیں۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳)

ایک اور مقام پر آپؑ نے فرمایا :

"ولا تقسروا اولادکم علی آدابکم فانھم مخلوقون لزمان غیر زمانکم"

"اپنے بچوں اور اولادوں کو اپنے زمانے کے آداب اور روش کے مطابق پروان نہ چڑھاؤ کیونکہ وہ تمہارے زمانے سے جدا ایک دوسرے زمانے کے لئے خلق ہوئے ہیں۔"

(شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید۔ ج ۲۔ کلمہ ۱۰۲۔ ص ۲۶۷)

ایسے لوگ جو اپنی آزادی اور استقلال چھین لئے جانے پر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں، اور ایسے حالات میں صبر و قرار سے بیٹھے رہتے ہیں، ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے :

"ان الذین توفاھم الملائکۃ ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم؟ قالوا کنا مستضعفین فی الارض، قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا فاولئک ماواھم جھنم وساءت مصیرا"۔

"جن لوگوں کو فرشتوں نے اس حال میں اٹھایا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے تھے، ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے۔ انھوں نے کہا

کہ ہم زمین میں کمزور بنا دیئے گئے تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بد ترین ٹھکانہ ہے۔" (سورہ نساء ۴۔ آیت ۹۷)

اور امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں :

"ولا تکن عبد غیرک وقد جعلک اللہ حرا۔"

"دوسروں کے غلام نہ بنو کیونکہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔"

(نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۳۱)

روزِ عاشور امام حسینؑ کے شعائر میں سے ایک شعار یہ بھی تھا کہ :

"ان لم یکن لکم دین وکنتم لا تخافون المعاد فکونوا احرارا فی دنیاکم"

"اگر تم دیندار نہیں، تمہیں روزِ قیامت کا کوئی خوف نہیں تو کم از کم دنیا ہی میں آزاد مردوں کی طرح رہو۔"

اور اس بارے میں امام جعفر صادقؑ کا قول ہے :

"ان اللہ فوض الی المومن امورہ کلھا ولم یفوض الیہ ان یذل نفسہ' ان المومن اعز من الجبل۔"

"بے شک خدا نے مومن کو اسکے تمام امور تفویض کردیئے ہیں' ۔ اس امر کو اسے تفویض نہیں کیا کہ وہ خود کو ذلیل و خوار بنائے کیونکہ مومن پہاڑ سے زیادہ عزیز اور سربلند ہے۔" (مشکوۃ الانوار ۔ ص ۲۴۵)

نہج البلاغہ کی روشنی میں

معاشرتی ذمے داری

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا :

"اتقوا اللّٰہ فی عبادہ و بلادہ فانکم مسوولون حتی عن البقاع و البھائم"

"اللہ سے ڈرو، اس کے بندوں کے بارے میں بھی اور شہروں کے بارے میں بھی، اس لئے کہ تم سے ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا، یہاں تک کہ زمینوں اور چوپایوں کے بارے میں بھی۔"

(نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۶۵)

امتِ اسلامیہ کی افسوسناک صورتحال

دورِ حاضر میں امتِ اسلامیہ کی حالت انتہائی افسوسناک، ناگفتہ بہ اور انحطاط پذیر ہے۔ وہ اسلام، جو اس امت کی عزت و کرامت اور زندگی کا سرچشمہ تھا، اسے میدانِ حیات سے خارج کر دیا گیا ہے اور اب صرف کتب خانوں میں اور علماو دانشوروں کے سینوں میں مقید اور رسوم و رواج کی حد تک باقی رہ گیا ہے۔ جبکہ مسلمان اسلامی ممالک پر غیروں کے تسلط اور غلبے کا نظارہ کرنے والے تماش بین بن کے رہ گئے ہیں۔ چھوٹی

چھوٹی اقوام بھی جب چاہیں ملتِ مسلمہ کی عزت وناموس سے کھیل جاتی ہیں اور مسلمانوں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔

قومیت' فرقہ واریت' گروہ بندی اور مسلمان حکمرانوں کے ذاتی مفادات نے پیکرِ امت کو جگہ جگہ سے مجروح کردیا ہے۔

اسلامی ممالک کے انتہائی مال ودولت اور زرخیز زمینوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمان فقرومسکنت' ناتوانی اور محرومیت کے عالم میں زندگی بسر کررہے ہیں اور پسماندگی اور انحطاط ہر لحظہ انہیں اپنے شکنجے میں کستا چلاجارہا ہے اور ہر شعبہء حیات پر مسلط اور چھایا ہوا ہے۔

اگر اس تاسف انگیز اور دردناک ماحول میں زندگی بسر کرنے والے فرزندانِ امت کے کردار پر نظردوڑائی جائے تو اسکا نقشہ کچھ یوں سامنے آتا ہے۔

۱ : بے تعلقی

افرادِ امت کی اکثریت اجتماعی امور سے بے تعلق ہے' بیشتر لوگوں کی سوچ اور جدوجہد اپنے ذاتی مفاد کی حدود سے باہر نہیں نکلتی۔ جوانی میں ان کی سعی وکوشش کا محور صرف اور صرف اپنی تعلیم ہوتی ہے۔ اسکے بعد اگر ممکن ہوتا ہے تو مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک چلے جاتے ہیں اور وہاں سے واپس پلٹنے کے بعد کوئی انتہائی اچھی ملازمت اور بلند عہدہ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ پھر آراستہ گھر' نئے ماڈل کی کار اور خوبصورت شریکِ حیات کا حصول ان کا نصب العین بن جاتا ہے۔

انہی میں سے اگر کسی کو اپنے ذاتی کاروبار کا موقع ملے تو وہ شب وروز اسکی لامحدود وسعت کی فکر میں رہتا ہے۔ ایک کے بعد ایک آفس کھولتا چلاجاتا ہے اور اگر فرصت کے کچھ لمحات میسر آتے ہیں تو انہیں مہنگے ہوٹلوں اور کھانے پینے کے مراکز میں بہترین خوش مزہ کھانوں یا سیر سپاٹے کی نذر کر دیتا ہے۔ ان تمام سرگرمیوں کے دوران اسکے پاس کوئی ایسا وقت نہیں ہوتا جس میں وہ اپنی اجتماعی ذمے داریوں اور معاشرے کے

حوالے سے اپنے فرائض کے بارے میں غور و فکر کرے' اپنے دین' اپنے وطن اور انسانیت کو مصائب و مشکلات' رنج والم سے نجات دلانے کی بابت سوچے۔

آپ اس طبقے اور ان حیوانات کے درمیان انتہائی معمولی فرق پائیں گے جنہیں اپنے خوردوخواب کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں ہوتی۔

حضرت علیؑ اپنے ایک کلام میں مذکورہ طرز عمل کے حیوانی ہونے کی جانب اشارہ کرتے ہیں اور معاشرتی مسائل سے بے تعلقی کی مذمت کرتے ہوئے'اس موقف سے نفرت کا اظہار کرتے اور اسے اپنانے سے منع فرماتے ہیں :

"ولو شئت لاھتدیت الطریق الی مصفّٰی ھٰذا العسل' ولبٰاب ھٰذا القمح ونسائج ھٰذا القز' ولکن ھیھات ان یغلبنی ھوای' ویقودنی جشعی الٰی تخیر الاطعمۃ۔ ولعل بالحجاز او الیمامۃ من لا طمع لہ فی القرص' ولا عھد لہ بالشبع۔ اوابیت مبطانا وحولی بطون غرثی واکباد حرٰی۔۔۔ فما خلقت لیشغلنی اکل الطیبات کالبھیمۃ المربوطۃ ھمھا علفھا او المرسلۃ شغلھا تقممھا۔۔۔"

"اگر میں چاہتا تو خالص شہد' عمدہ گیہوں اور ریشمی کپڑوں کے حصول کے ذرائع پیدا کر سکتا تھا۔ لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشات مجھ پر غلبہ کرلیں اور حرص مجھے اچھے اچھے کھانوں کے چن لینے کی دعوت دے جبکہ بہت ممکن ہے کہ حجاز یا یمامہ میں ایسے افراد بھی ہوں جنہیں ایک روٹی بھی ملنے کی آس نہ ہو اور کبھی انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں شکم سیر ہو کر پڑا رہوں اس حال میں کہ میرے گردوپیش بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں۔۔۔ میں اسلئے تو پیدا نہیں کیا گیا ہوں کہ اچھے اچھے کھانوں کی فکر میں لگا رہوں اور ان جانوروں کی مانند ہو جاؤں

کہ جب وہ بندھے ہوئے ہوتے ہیں تو ان کی پوری فکر اپنے چارے کے لئے ہوتی ہے اور آزاد ہوتے ہیں تو ان کا تمام مشغلہ ادھر ادھر منہ مار کر چرنا ہوتا ہے۔" (نہج البلاغہ - مکتوب ۴۵)

امامؑ اسی کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتے ہیں :

"اتمتلی ء السائمة من رعیها فتبرک ؟ وتشبع الربیضة من عشبها فتربض؟ ویاکل علی من زاده فیهجع! قرت اذا عینه اذا اقتدی بعد السنین المتطاولة بالبهیمة الهاملة والسائمة المرعیة!"

"کیا یہ ممکن ہے کہ جس طرح بکریاں پیٹ بھرنے کے بعد سینے کے بل بیٹھ جاتی ہیں اور گھاس سے سیر ہو کر اپنے باڑے میں لیٹ جاتی ہیں، اسی طرح علیؑ بھی اپنے آس پاس کا کھانا کھا کر سو جائے۔ اسکی آنکھیں پھوٹیں اگر وہ زندگی کے طویل سال گزارنے کے بعد آوارہ مویشیوں اور چرنے والے حیوانات کی پیروی کرنے لگے۔" (نہج البلاغہ - مکتوب ۴۵)

۲ : منفی طرزِ عمل

بعض لوگ امت کی اس پسماندگی اور انحطاط کو درک کرتے ہیں اور اس دردناک اور تاسف انگیز صورتحال پر رنجیدہ بھی ہیں لیکن اسکے ازالے کے لئے کوئی ذمے داری ادا کرنے پر تیار نہیں ہوتے، بلکہ اس صورتحال سے چھٹکارے کے لئے کوششوں کا خود کو ذمے دار ہی نہیں سمجھتے، اور اپنے آپ کو ان حالات میں تبدیلی لانے کے لئے جدوجہد کا پابند نہیں سمجھتے۔

ان کے نزدیک ہر فرد کی ذمے داری فقط یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی اصلاح کرے، پابندی سے نماز پڑھے، حقوقِ شرعی ادا کرے اور محرمات سے پرہیز کرے۔ جب کبھی یہ لوگ معاشرے کی گمراہی اور امت کی زبوں حالی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ہائے

افسوس‘ لاحول ولا قوتہ الا باللہ اور رنجیدہ لہجے میں اناللہ وانا الیہ راجعون جیسے کلمات زبان سے جاری کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انہیں اس نے ان گمراہیوں‘ لغزشوں اور کٹھن حالات سے محفوظ رکھا ہے۔

کیا یہ کہنا کہ انسان صرف اپنی اصلاح کا ذمے دار ہے درست اور عاقلانہ بات ہے؟ کیا اسے دوسروں کی گمراہی‘ انحراف اور خرابیوں سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے؟ خواہ ساری دنیا گمراہی کے گہرے غار میں جا پڑے!! نیز کیا اسے اپنے دینی بھائیوں کی مشکلات‘ پریشانیاں اور مصائب دیکھنے کے باوجود صرف تاسف کے اظہار پر اکتفا کرنا چاہے؟

کیا روز قیامت خداوندعالم ہم سے صرف نماز‘ روزے اور انفرادی فرائض کے بارے میں سوال جواب‘ حساب کتاب کرے گا؟ کیا اجتماعی فرائض وذمے داریوں اور اصلاحِ معاشرہ کے فریضے کے بارے میں ہم سے سوال نہیں کیا جائے ہوگا؟

ان سوالات کے جواب ہماری آئندہ گفتگو کے دوران واضح ہوجائیں گے۔

۳ : ذمے داری قبول کرنا

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کے بارے میں خود کو ذمے دار سمجھے جو اسکے سامنے واقع ہوتی ہیں‘ جو اسے نظر آتی ہیں۔ نیز اسے معاشرے کے اقتصادی مسائل کی اصلاح‘ سماج میں عدل وانصاف کے قیام اور دنیا میں امتِ اسلامیہ کی عزت و وقار کی حفاظت اور سربلندی کے سلسلے میں اپنی ذمے داری قبول کرنی چاہئے اور اسے اس بات پر پکا اعتقاد رکھنا چاہئے کہ روزِ قیامت خداوند متعال اسکے اجتماعی کردار کے بارے میں بھی مواخذہ کرے گا۔

مذکورہ موقف کی حقانیت کے ثبوت کے لئے درجِ ذیل نکات پیشِ خدمت ہیں۔

اگر خداوند متعال ہم سے سوال کرے کہ اس روئے زمین پر ہماری خلقت کا کیا مقصد ہے؟ تو اس سوال کے جواب کی تلاش کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کی صریح آیات روئے زمین پر ہماری خلقت کا مقصد زمین کی اصلاح اور آبادکاری قرار دیتی

ہیں۔ آیات قرآنی کی رو سے انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ' نائب اور نمائندہ ہے۔ جب خداوند متعال نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو خلق کیا تو فرشتوں سے فرمایا :

"انی جاعل فی الارض خلیفة"

"میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔" (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۳۰)

ایک اور آیت میں فرمایا :

"ھوالذی جعلکم خلائف الارض"

"وہی وہ خدا ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا"

(سورہ انعام ۶۔ آیت ۱۶۵)

نیز فرمایا :

"ھوانشاکم من الارض واستعمر کم فیھا"

"وہ ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا ہے اور اس کی آباد کاری تمہارے سپرد کی ہے۔" (سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۶۱)

اگر ہم زمین پر خدا کے نمائندے' خلیفہ اور جانشین ہیں تو کیا زمین پر ہونے والی سرگرمیوں کے ذمے دار نہیں؟ کیا ایک تاجر جو باہر کسی مقام پر اپنا نمائندہ مقرر کرتا ہے' اسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ وہاں اپنے تجارتی معاملات کے بارے میں اس نمائندے سے سوال جواب کرے' اسکا محاسبہ کرے؟

اسی طرح ایک ایسا شخص جو کسی کو اپنے کسی کام کے لئے اپنا نمائندہ اور کارندہ معین کرتا ہے کیا اسے اس نمائندے سے یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ اسکے کاموں کو حسن وخوبی سے نمٹائے گا اور اسے نقصان سے محفوظ رکھے گا؟

واضح بات ہے کہ جب خداوند عالم ہمیں زمین پر اپنا نمائندہ اور خلیفہ قرار دے گا تو ہم سے زمین میں اصلاح اور گمرائیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف جدوجہد کا تقاضا بھی کرے گا۔

"ثم جعلنا کم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر

کیف تعملون"

"اس کے بعد ہم نے تم کو روئے زمین پر ان کا جانشین بنادیا تاکہ دیکھیں کہ اب تم کیسے اعمال کرتے ہو۔" (سورہ یونس ۱۰۔ آیت ۱۴)

"فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض۔"

"تو تمہارے پہلے والے زمانوں اور نسلوں میں ایسے صاحبانِ عقل کیوں نہیں پیدا ہوئے ہیں جو لوگوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے۔"

(سورہ ہود ۱۱۔ آیت ۱۱۶)

"الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر"

"یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے زمین میں اختیار دیا تو انھوں نے نماز قائم کی اور زکات ادا کی اور نیکیوں کا حکم دیا اور برائیوں سے روکا۔"

(سورہ حج ۲۲۔ آیت ۴۱)

یہ جان لینے کے بعد کہ ہماری خلقت کا مقصد زمین کی آبادکاری، اصلاح اور یہاں حق اور نیکی کا قیام ہے، کیا یہ بات صحیح ہوگی کہ ہم اپنی آنکھوں سے یہ دردناک مناظر دیکھنے کے بعد بھی لاتعلقی کا کردار اپنائیں؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"فانکم مسوولون حتی عن البقاع والبھائم"

"تم سے ہر چیز کے بارے میں باز پرس کی جائے گی یہاں تک کہ زمینوں اور مویشیوں کے بارے میں بھی۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶۵)

خداوند عالم نے اس عظیم الشان دین (اسلام) کو انسانوں کو شقاوت، جہل اور گمراہی سے نجات دلانے اور سعادت اور ابدی کمال کی سمت سفر کے لئے نازل کیا ہے، تاکہ یہ حیاتِ انسانی کے ہر میدان اور ہر پہلو کی تنظیم کرے۔

ہر مسلمان بغیر کسی شک وشبہ کے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ اسلام اہلِ زمین کی سیادت وسعادت کے لیے نازل کیا گیا ہے۔اس بارے میں قرآن کریم فرماتا ہے :

”ھوالذی ارسل رسوله بالھدی ودین الحق لیظھره علی الدین کله“

”وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے۔“ (سورہ توبہ ۹۔ آیت ۳۳)

نیز ارشاد ہوتا ہے :

”لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط“

”بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔“ (سورہ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

ایک دوسری آیت میں آیا ہے :

”انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما ارٰک اللّٰه“

”ہم نے آپ کی طرف یہ برحق کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان حکمِ خدا کے مطابق فیصلہ کریں۔“ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۱۰۵)

تاہم کس طرح اسلام کو اپنی زندگی میں لاگو کر کے اسکا اجراء کیا جاسکتا ہے؟ کیا فرشتوں یا جنات کے توسط سے خدا کی براہ راست مداخلت کے ذریعے اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن ہے؟ یعنی کیا خدا بالجبر اسلامی قوانین کا نفاذ کرے گا؟ یا یہ کہ جو لوگ اسلامی قوانین کی پابندی نہ کریں انہیں تباہ وبرباد کردے گا؟

اگر براہ راست آسمانی مداخلت ہو تو درحقیقت اس سے انسانی زندگی کی قدروقیمت اور اہمیت ہی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیاوی زندگی کو انسانوں کی

آزمائش کا مقام بنایا ہے۔ لہٰذا اس امتحان گاہ میں انسان کو مکمل طور پر آزادی اور اختیار کا مالک ہونا چاہیئے۔

خداوندعالم خود انسانوں کے توسط سے روئے زمین پر اپنی شریعت کا نفاذ چاہتا ہے' لہٰذا اس دین پر عمل پیرا انسانوں کو الٰہی شریعت کے نفاذ اور اسے جامہ ء عمل پہنانے کے سلسلے میں فعال اور موثر کردار ادا کرنا چاہیئے۔

جس طرح معاصر مکاتب جیسے کمیونزم اور کیپٹل ازم کے طرفدار ان نظاموں کے نفاذ کے لئے جدید ذرائع کے ذریعے وسیع سرگرمیوں میں مشغول ہیں' اسی طرح فرزندانِ اسلام اور دینِ خدا کے پیروکاروں پر بھی فرض ہے کہ اسلام کی تبلیغ و ترویج اور نفاذ کے لیے انتھک اور بے وقفہ جدوجہد کریں۔

جب اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر اپنے دشمنوں سے جنگ کا فریضہ عائد کیا تو ان لوگوں نے کاہلی کا مظاہرہ کیا اور خداوندعالم سے کہا کہ وہ اپنے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس مہم کو انجام دے۔

اس موقع پر اللہ تعالٰی نے بنی اسرائیل کو کیا جواب دیا؟ اور ان کا کیا انجام ہوا' قرآن کریم اس چیز کو ہمارے گوش گزار کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"یا قوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین' قالوا یا موسیٰ ان فیھا قوما جبارین وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا فانا داخلون ○ قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیھما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین○ قالوا یا موسیٰ انا لن ندخلھا ابداً مادا موا فیھا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون○ قال رب انی لا املک الا نفسی واخی

فافرق بیننا و بین القوم الفاسقین○ قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض فلاتاس علی القوم الفاسقین"

"اور اے قوم اس ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور میدان سے الٹے پاؤں نہ پلٹ جاؤ کہ الٹا خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ ان لوگوں نے کہا کہ موسیٰ وہاں تو جابروں کی قوم آباد ہے اور اس وقت تک داخل نہ ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں، پھر اگر وہ نکل گئے تو ہم یقیناً داخل ہو جائیں گے۔ مگر دو انسان جنہیں خدا کا خوف تھا اور ان پر خدا نے فضل و کرم کیا تھا انھوں نے کہا کہ ان کے دروازے سے داخل ہو جاؤ، اگر تم دروازے میں داخل ہو گئے تو یقیناً غالب آجاؤ گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر صاحبانِ ایمان ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ موسیٰ ہم ہرگز وہاں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ لوگ وہاں ہیں، آپ اپنے پروردگار کے ساتھ جاکر جنگ کیجئے، ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ موسیٰ نے کہا پروردگار میں صرف اپنی ذات اور اپنے بھائی کا اختیار رکھتا ہوں لہٰذا ہمارے اور اس فاسق قوم کے درمیان جدائی پیدا کردے۔ ارشاد ہوا کہ اب ان پر چالیس سال حرام کردیئے گئے کہ یہ زمین میں چکر لگاتے رہیں گے لہٰذا تم اس فاسق قوم پر افسوس نہ کرو۔" (سورہ مائدہ ۵ - آیات ۲۱ تا ۲۶)

اگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں طرزِ حیات اور دستورِ عمل کے طور پر نفاذ اور اجراء کے لئے خداوند متعال کی طرف سے نازل ہوا ہے، نیز خداوند عالم کی جانب سے اسکے نفاذ اور قیام کے لئے عالمِ غیب سے دخل اندازی کا امکان نہیں، تو اس عقیدے کی رو سے ہم پر اسلام کے رواج اور معاشرے میں اسکے نفاذ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس بارے میں خداوند سبحان فرماتا ہے :

"وکذٰلک جعلنا کم امة وسطالتکونواشھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا"

"اور ہم نے تم کو درمیانی امت قرار دیا ہے تاکہ تم لوگوں کے اعمال کے گواہ رہو اور پیغمبر تمہارے اعمال کے گواہ رہیں۔"

(سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۱۴۳)

نیز فرماتا ہے :

"کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔"

"تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظرِ عام پر لایا گیا ہے، تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو۔"

(سورہ آل عمران ۳۔ آیت ۱۱۰)

یہیں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے انفرادی فرائض کی بجا آوری سے آگے بڑھ کر معاشرے میں انقلاب اور اسلامی قوانین کی بنیاد پر عوام الناس کی اصلاح بھی ہماری ذمے داری ہے۔

پس اگر مسلمان نماز اور روزے وغیرہ جیسے اعمال کی پابندی کے ذریعے یہ سمجھتے ہوں کہ اسطرح وہ اپنے دین کی حفاظت کررہے ہیں اور وہ معاشرتی سطح پر کسی انقلابی عمل اور اجتماعی کردار کے حامل نہ ہوں، تو کیا نتیجہ بر آمد ہو گا؟

ظاہر ہے کہ مومنین کی اس بے عملی کا ناقابلِ اجتناب اور حتمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل اور برائیوں کو کھلا میدان مل جائے گا، پھر ظالم اور اشرار معاشرے پر مسلط ہوجائیں گے اور معاملات کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ کیونکہ یہی معاشرتی حیات کی خاصیت اور رسم ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے :

"ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض"

"اور اگر اسی طرح خدا بعض کو بعض سے نہ روکتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا۔" (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۱)

اور اگر معاشرے پر ظالموں اور اشرار کی حکومت قائم ہوجائے' اور وہ تمام معاملات وامور پر قابض ہوجائیں تو کیا اسکے بعد نماز گزار اور روزہ دار افراد ان اشرار کے ظلم وستم' ان کی تباہ کاریوں اور پابندیوں سے محفوظ رہ سکیں گے۔ یا یہ کہ ظالم سب سے پہلے انہی پر ہاتھ صاف کریں گے؟ سب سے پہلے انہی کو نقصان اٹھانا پڑے گا؟

تاریخی تجربات اور گزشتہ حوادث وواقعات کا فراہم کردہ ثبوت یہ ہے کہ جب ظالم اور بدکار لوگ معاشرے کے معاملات اور حکومت و اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تو گوشہ نشین اور معاشرتی امور سے بے تعلق لوگوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ حد یہ ہے کہ وہ نماز گزاروں کو بھی آسانی کے ساتھ نماز ادا کرنے نہیں دیتے' انہیں بھی مطمئن اور آسودہ نہیں رہنے دیتے۔

اب چارہ کار کیا ہے؟

ہمیں علاج سے پہلے پرہیز اور حادثے سے پہلے احتیاط کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ظلم وستم' برائیوں اور گمراہیوں کے غلبے سے پہلے اور اس سے قبل کہ برائیاں اور تباہکاریاں ہم پر مسلط ہوجائیں اور ہمارے انفرادی فرائض وواجبات کی ادائیگی میں بھی مانع ہونے لگیں' ہمیں ان کے خلاف جہاد کرنا چاہئے اور یہ وہ واحد راہِ حل ہے جسے دینِ اسلام نے بھی ہم پر لازم اور واجب کیا ہے۔ اس بارے میں خداوند منان کی ہدایت ہے :

"واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة۔"

"اور اس فتنے سے بچو جو صرف ظالمین کو پہنچنے والا نہیں ہے۔"

(سورہ انفال ۸۔ آیت ۲۵)

نیز حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے :

"لا تتركوا الامر بالمعروف والنهى عن المنكر

فیولی علیکم شرارکم ثم تدعون فلا یستجاب لکم"۔

"نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کو کبھی ترک نہ کرنا' ورنہ بدکار تم پر مسلط ہو جائیں گے' پھر تم دعا مانگو گے تو قبول نہ ہو گی۔"

(نہج البلاغہ - مکتوب ۴۷)

اور آپؑ ہی نہج البلاغہ میں ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

"لولم تتحاذلوا عن نصر الحق' ولم تھنوا عن توھین الباطل' لم یطمع فیکم من لیس مثلکم' ولم یقوم من قوی علیکم"

"اگر تم حق کی مدد کرنے میں کوتاہی کے مرتکب نہ ہوتے اور باطل کو کمزور بنانے میں سستی کا مظاہرہ نہ کرتے تو تم پر وہ قوم دانت نہ رکھتی جو تم جیسی نہیں ہے اور تم پر یہ لوگ قوی نہ ہو جاتے۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۶۴)

شریعتِ اسلام' نہایت صاف صاف الفاظ میں ہمیں معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کا ذمے دار قرار دیتی ہے اور معاشرے میں انقلاب اور تبدیلی کے لیے جدوجہد ہم پر واجب قرار دیتی ہے۔ پس نیکیوں کی ترویج اور برائیوں کا انسداد دو ایسے شرعی فرائض ہیں جو نماز اور روزے وغیرہ سے کم اہم نہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

"ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکرو اولئک ھم المفلحون۔" (سورہ آل عمران ۳- آیت ۱۰۴)

"اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے' نیکیوں کا حکم دے' برائیوں سے منع کرے' اور ایسے ہی لوگ نجات یافتہ ہیں۔"

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے :

"کلکم راع و کلکم مسوول عن رعیته"

"تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اپنے زیرِ نگراں لوگوں کا جوابدہ ہے۔" (نہج الفصاحہ)

حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"ما اخذ اللہ علی اہل الجھل ان یتعلموا حتٰی اخذ علی اھل العلم ان یعلموا۔"

"اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے علم حاصل کرنے کا عہد لینے سے پہلے علما سے تعلیم دینے کا عہد لیا ہے۔" (نہج البلاغہ - کلمات قصار ۴۷۸)

اسی طرح آپؑ کا یہ بھی ارشاد ہے :

"والذی فلق الحبة و برا النسمة لولا حضور الحاضر وقیام الحجة بوجود الناصر وما اخذ اللہ علی العلماء الا یقاروا علٰی کظة ظالم ولا سغب مظلوم' لا لقیت حبلھا علٰی غاربھا"

"وہ خدا گواہ ہے جس نے دانے کو شگافتہ کیا ہے اور ذی روح کو پیدا کیا ہے کہ اگر حاضرین کی موجودگی اور انصار کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور اللہ کا اہلِ علم سے یہ عہد نہ ہوتا کہ خبردار ظالم کی شکم سیری اور مظلوم کی بھوک پر چین و قرار سے نہ بیٹھے رہنا تو میں آج بھی خلافت (کے اس اونٹ) کی لگام اسی کی گردن پر ڈال کر ہنکا دیتا اور اس سے صرفِ نظر کرتا۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۳)

جی ہاں! شریعتِ اسلامی جرم وجنایت، ظلم و ستم دیکھ کر خاموش تماشائی بنے رہنے والے کو ظالم اور مجرم کا شریکِ کار قرار دیتی ہے۔ اور اس تماشائی کو بھی عذاب اور سزا

کا مستحق سمجھتی ہے۔ اس بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے :

"ان اللّٰہ اوحی الی نبیہ شعیب انی معذب من قومک مائۃ الف' اربعین من شرارھم وستین من خیارھم! قال شعیب : یارب' ھولاء الاشرار' فما ذنب الا خیار؟ قال : لانھم داھنوا اھل المعاصی ولم یغضبوا لغضبی"

"اللہ رب العزت نے اپنے ایک نبی حضرت شعیب پر وحی کی کہ میں تمہاری قوم کے ایک لاکھ افراد کو عذاب کا مزا چکھاؤں گا۔ ان میں سے چالیس ہزار اشرار ہیں اور ساٹھ ہزار افراد نیک ہیں۔ حضرت شعیب نے عرض کیا : اے پروردگار! اشرار کو تو ان کے کئے کی سزا ملے گی لیکن ان نیک افراد کا گناہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : یہ لوگ گناہگار افراد کے ساتھ رہا کرتے تھے اور میرے ان سے ناراض ہونے کے باوجود یہ ان سے اظہارِ ناراضگی نہ کرتے تھے۔"

آنحضرتؐ ہی کا فرمان ہے :

"من رای سلطانا جائرا۔۔۔ فلم یغیر علیہ بقول ولا بفعل کان حقًا علی اللّٰہ ان یدخلہ مدخلہ"

"جو کوئی بھی ظالم بادشاہ کے دور میں زندگی بسر کرے۔۔۔ اور اپنے قول یا عمل سے اسے بدلنے کی کوشش نہ کرے تو خداوند عالم کو حق ہے کہ جہاں اس (ظالم بادشاہ) کو ڈالے' اس شخص کا ٹھکانہ بھی وہیں قرار دے۔"

حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"الراضی بفعل قوم کالداخل فیہ معھم۔"

"کسی جماعت کے فعل پر رضا مند ہونے والا ایسا ہی ہے جیسے اس فعل میں شریک ہو۔" (نہج البلاغہ ۔ کلمات قصار ۱۵۴)

نیز آپؑ ہی فرماتے ہیں :

"انمایجمع الناس الرضی والسخط وانما عقر ناقة ثمود رجل واحد فعمهم الله بالعذاب لما عموه بالرضی فقال سبحانه : فعقروها فاصبحو انادمین"

"یاد رکھو کہ (افعال واعمال مختلف ہونے کے باوجود) رضا اور ناراضگی کے جذبات ہی تمام لوگوں کو ایک حکم میں لے آتے ہیں۔ آخر ناقہء صالح کے پیر ایک ہی شخص نے کاٹے تھے لیکن اللہ نے عذاب سب پر نازل کیا' کیونکہ باقی تمام لوگ اس شخص کے اس عمل پر راضی تھے اور فرمایا : ان لوگوں نے ناقے کے پیر کاٹ ڈالے اور آخر میں ندامت کا شکار ہوگئے۔" (نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۹۹)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :

"فان اللہ سبحانہ لم یلعن القرن الماضی بین ایدیکم الا لترکھم الامر بالمعروف والنھی عن المنکر' فلعن اللہ السفھاء لرکوب المعاصی والحلماء لترک التناھی"

"دیکھو خداوند عالم نے گزشتہ امتوں کو محض اس لئے اپنی رحمت سے دور رکھا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر چکے تھے' جس کے نتیجے میں جہلا پر ارتکابِ گناہ کی بنا پر لعنت ہوئی اور علما پر انہیں اس سے باز نہ رکھنے کی بنا پر لعنت کی گئی۔" (نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۱۹۰)

خلاصہء کلام

- امت انحطاط اور پسماندگی میں مبتلا ہے اور اسکی یہ حالت انتہائی افسوس ناک اور

غم انگیز ہے۔

- ان حالات کے مقابل مسلمانوں کا موجودہ طرز عمل انتہائی غیر ذمے دارانہ اور غیر انسانی ہے۔

- امت پر پڑنے والے مصائب و آلام کو دیکھنے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت کا تماشائی بنے رہنا اور ان مشکلات کے ازالے کے سلسلے میں کوششوں سے لاتعلق رہنا ان کی خودغرضی اور عاقبت نا اندیشی کی انتہا ہے۔

- عقل و شرع کی رو سے درست موقف یہ ہے کہ ہر مسلمان موجودہ حالات کی اصلاح اور کمال و سعادت کی سمت انسانیت کی رہنمائی کے سلسلے میں اپنی ذمے داری سے عہدہ بر آ ہو۔

المختصر شریعتِ اسلامی انتہائی صراحت کے ساتھ اور واضح الفاظ میں وقوع پذیر ہونے والی صورتحال کی ذمے داری خود ہمارے کاندھوں پر ڈالتی ہے اور حوادث کا سامنا کرنے، زندگی کے راستے اور اپنی حیات کو سمت دینے کو ہم پر فرض اور واجب قرار دیتی ہے۔

نہج البلاغہ کی روشنی میں

جہاد

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"اما بعد فان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اوليائه وهو لباس التقوىٰ ودرع الله الحصينة وجنته الوثيقة فمن تركه رغبة عنه البسه الله ثوب الذل وشمله البلاء وديث بالصغار والقماءة وضرب على قلبه بالاسهاب واديل الحق منه تبضييع الجهاد وسيم الخسف ومنع النصف"

"جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے' جسے اللہ نے اپنے خاص دوستوں کے لئے کھولا ہے۔ یہ پرہیز گاری کا لباس' اللہ کی محکم ذرہ اور مضبوط سپر ہے۔ جو اس سے پہلو تہی کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیتا ہے خدا اسے ذلت و خواری کا لباس پہناتا اور مصیبت و ابتلا کی ردا اوڑھا دیتا ہے اور وہ ذلتوں اور خواریوں کے ساتھ ٹھکرا دیا جاتا ہے اور مدہوشی اور غفلت کا پردہ اسکے دل پر چھا جاتا ہے' اور جہاد کو ضائع و برباد کرنے سے حق اسکے ہاتھ سے چھین لیا جاتا ہے' ذلت اسے سہنا پڑتی ہے اور وہ انصاف سے محروم ہو جاتا ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۷)

جہاد کی اہمیت

اسلامی شریعت کے مصادر (قرآنِ کریم اور سنتِ مطہر) کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص بخوبی جان سکتا ہے کہ ان میں جہاد کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ صرف قرآن کریم میں ایسی تقریباً چالیس آیات موجود ہیں جن میں لفظ "جہاد" اور اس سے نکلنے والے الفاظ کے ذریعے جہاد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً :

"یاایھاالنبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم"

"اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔"

(سورہ توبہ ۹۔ آیت ۷۳)

نیز ارشاد ہے :

"انفروا خفافا وثقالا وجاھدوابامو الکم وانفسکم فی سبیل اللہ"

"(مسلمانو!) تم ہلکے ہو یا بھاری، گھر سے نکل پڑو اور راہ خدا میں اپنے اموال اور نفوس سے جہاد کرو۔" (سورہ توبہ ۹۔ آیت ۴۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :

"وفضل اللہ المجاھدین علی القاعدین اجرا عظیما"

"اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں کے مقابلے میں اجرِ عظیم عطا کیا ہے۔"

(سورہ نساء ۴۔ آیت ۹۵)

اسی طرح ایک سو سے زیادہ آیات قرآنی ایسی ہیں جن میں جہاد کا تذکرہ لفظ "قتال" اور اس سے نکلنے والے الفاظ کے ذریعے آیا ہے۔ مثال کے طور پر :

"فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم"

"تو کفر کے سربراہوں سے کھل کر جہاد کرو کہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔" (سورہ توبہ ۹۔ آیت ۱۲)

فرمایا گیا ہے :

"وقاتلوھم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله"

"اور تم لوگ ان کفار سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنے کا وجود نہ رہ جائے۔" (سورہ انفال ۸ - آیت ۳۹)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے :

"ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله امواتا بل احیاء عند ربھم یرزقون"

"اور خبردار راہ خدا میں قتل ہونے والوں کو مردہ خیال نہ کرنا، وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں رزق پا رہے ہیں۔"

(سورہ آل عمران ۳ - آیت ۱۶۹)

علاوہ ازایں متعدد آیات میں غزوہ، حرب، شہادت اور ان سے ماخوذ الفاظ کے ذریعے جہاد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ جبکہ قرآن کریم میں حج کے مسئلے پر محض پانچ آیات، خمس کے موضوع پر صرف ایک آیت اور روزے کے بارے میں فقط دس آیات پائی جاتی ہیں۔

جب ہم معصومینؑ کی سنت پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسی سینکڑوں احادیث کا مشاہدہ کرتے ہیں جو جہاد کے موضوع پر تاکید کرتی ہیں، اور وضاحت کے ساتھ، صاف صاف الفاظ میں کہتی ہیں کہ حتمی طور پر جہاد کو دوسرے اعمال و عبادات کی نسبت انتہائی اہمیت اور خاص فضیلت حاصل ہے۔

رسول کریمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں :

"فوق کل ذی بر بر حتی یقتل الرجل فی سبیل الله فاذا قتل فی سبیل الله فلیس فوقه بر"

"ہر نیکی اور خوبی سے برتر ایک نیکی اور خوبی موجود ہے، یہاں تک کہ کوئی راہ خدا میں قتل ہو جائے۔ پس اگر کوئی راہ خدا میں مارا جائے، تو اس

سے بڑھ کر کسی نیکی کا وجود نہیں۔" (بحار الانوار۔ ج ۹۷۔ ص ۶۱)
اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :
"الجهاد الذی فضله الله علی الاعمال وفضل عامله علی العمال تفضيلا فی الدرجات والمغفرة"
"جہاد ہے جسے خداوند عالم نے تمام اعمال پر فضیلت دی ہے اور مجاہد کو تمام عمل کرنے والوں پر مغفرت کے لحاظ سے بھی اور درجے کے اعتبار سے بھی برتری بخشی گئی ہے۔"
نہج البلاغہ کے صفحات پر طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے جہاد کی عظمت اور اہمیت کو ایک خاص مقام اور بلند مرتبے پر رکھا ہے، اور اسے ایک عظیم صفت کے طور پر یاد فرمایا ہے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں :
"الجهاد عز الاسلام۔۔۔"
"جہاد اسلام کی عزت اور سرفرازی ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۲۵۲)

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :
"الله الله فی الجهاد باموالکم وانفسکم والسنتکم فی سبيل الله"
"اور اللہ سے ڈرو اپنے جان، مال اور زبان سے راہ خدا میں جہاد کے بارے میں۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۷)
ایک وصیت کے دوران فرماتے ہیں :
"وجاهد فی الله حق جهاده، ولا تاخذک فی الله لومة لائم"
"راہ خدا میں جہاد کا حق ادا کر دینا اور خبردار اس راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرنا۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا :

"ان افضل ما توسل به المتوسلون الی اللہ سبحانہ و تعالی الایمان بہ وبرسولہ والجهاد فی سبیلہ فانہ ذروۃ الاسلام وکلمۃ الاخلاص"

"اللہ والوں کے لئے اسکی بارگاہ تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ اللہ اور اسکے رسولؐ پر ایمان اور راہ خدا میں جہاد ہے کہ جہاد اسلام کی سربلندی ہے اور کلمہ ءاخلاص ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۱۰۸)

جہاد' صدرِ اسلام کے مسلمانوں کی زندگی اور حیاتِ عملی کا ناجدا ہو سکنے والا جز تھا' ان لوگوں نے جہاد کی صورت میں جنت تک پہنچنے کا مختصر اور سریع راستہ دریافت کر لیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک جہاد فی سبیل اللہ کے موقع کا منتظر رہتا تھا اور اس سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا اور ایک دوسرے کو اسکی نوید و بشارت دیا کرتا تھا۔

صدرِ اسلام کے ایسے ہی مجاہدین کی ایک نمایاں مثال "حنظلہ بن ابی عامر" تھے۔انہوں نے جوانی میں انتہائی محنت مشقت کے بعد اپنی شادی کے لئے کچھ پیسہ اکھٹا کیا' عین شبِ زفاف جبکہ وہ اپنی عمر بھر کی جد و جہد کا پھل پانے کو تھے اور عین اس وقت جبکہ ان کے خواب تعبیر کا روپ دھارنے ہی کو تھے کہ ناگاہ انہوں نے ایک منادی کی صدا سنی جو مسلمانوں کو جہاد کے لئے پکار رہا تھا۔ انہوں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا' مسلمانوں کو دیکھا کہ منادی کی ندا کے جواب میں آمادۂ سفر ہیں۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انہوں نے اپنی زوجہ کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور غسلِ جنابت سے پہلے ہی جہاد کے لئے بلانے والے کی صدا پر لبیک کہا۔ ان کی زوجہ نے راہ خدا کے اس مجاہد کے جذبات کو تحریک دے کر کوشش کی انہیں محاذِ جنگ پر جانے سے روکے' لیکن وہ مصر تھے کہ دینِ خدا کی نصرت کے لئے ضرور جائیں گے اور یوں انہوں نے اپنی شادی کی صبح فیضِ شہادت حاصل کیا۔

ایسی ہی دوسری مثال "عمرو ابن الجموع" کی ہے، جو اپنی عمر کے برسہا برس گزار چکے تھے۔ ایک غزوے میں اپنے ایک پیر سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ اس نقص کے باوجود جب انہوں نے جہاد کی ندا سنی اور اپنے چار بیٹوں کو جہاد پر جانے کی تیاریوں میں مشغول پایا، تو خود بھی میدانِ جہاد میں جانے کو بے تاب ہو گئے اور اپنے بیٹے اور بیوی کی مخالفت کے باوجود کفار سے جنگ کے موقع پر دوسروں سے پیچھے رہنے پر تیار نہ ہوئے۔ لہٰذا اسی طرح لنگڑاتے ہوئے گھر سے نکلے اور کہا : میں اس ناقص پیر اور لنگڑاہٹ کے ساتھ جنت میں جانا چاہتا ہوں۔

ایک اور مثال "قاسم ابن الحسنؑ" کی ہے کہ روزِ عاشورا جبکہ ابھی آپ کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہ تھی، آپ اپنے چچا امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے جنگ کی اجازت طلب کی۔ اس گفتگو کے دوران امام حسینؑ نے ان سے دریافت کیا: بیٹا قاسم! موت کو کیسا پاتے ہو؟ انہوں نے بلا تامل جواب دیا : آپؑ کی رکاب میں آ جائے تو شہد سے بھی زیادہ شیریں۔

حیرت انگیز بات

اسلام کی جانب سے جہاد کے موضوع پر اس اہتمام اور تاکید کے باوجود اور اس بات کے باوصف کہ ہم مبارزے اور ایثار و فداکاری کی ایک پر شکوہ اور روشن تاریخ رکھتے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں کہ عصرِ حاضر کے مسلمانوں کے نزدیک جہاد کا موضوع بے اہمیت موضوعات کے زمرے میں شامل ہے۔ اور اسکے بارے میں گفتگو ان کے نزدیک مکمل طور پر ایک فضول گفتگو بن چکی ہے۔ گویا آج ان باتوں کا وقت نہیں۔ اس صورتحال کا نتیجہ جسدِ امت پر فلسطین، اریٹریا اور فلپائن (۱) جیسے زخموں کی صورت

---

۱ - کتاب ہذا قریباً پچیس سال پیشتر لکھی گئی ہے، اس لئے اس میں اس دور کے مسائل کا ذکر ہے، آج امت کے مسائل اور زخموں کی فہرست کافی طویل ہو چکی ہے جس میں کشمیر، بوسنیا، چیچنیا وغیرہ شامل ہوئے ہیں۔ البتہ آج امت کے جوانوں میں جہاد اور شہادت کی تڑپ بھی روز افزوں ہے۔

میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آج امتِ مسلمہ جنگ و جہاد کے میدانوں سے کوسوں دور ہے جبکہ اسلام دشمن قوتیں اپنے تمام تر ظالمانہ ہتھکنڈوں کے ساتھ میدان میں موجود ہیں۔

کیا جہاد کا فریضہ منسوخ ہو چکا ہے؟ اور اب مسلمانوں پر واجب اور ان سے مطلوب نہیں ہے؟ یا یہ کہ امتِ اسلامی کو جہاد کی ضرورت ہی نہیں رہی ہے؟

پس کیا بات ہے کہ مومنین جہاد سے منہ پھیرے ہوئے ہیں؟ کیوں جہاد کے بارے میں گفتگو کو مہمل چھوڑ دیا ہے' اور اسے عملی اور واقعی بات نہیں سمجھا جاتا ہے؟ کیوں جہاد کا نام سن کر اکثر لوگوں کے لبوں پر خندۂ استہزا آجاتا ہے؟

ہم آئندہ سطور میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

نفسانی برائیوں کے خلاف جنگ (جہادِ اکبر)

انسان اپنے فہم و شعور' سوج بوجھ کی رہنمائی میں عمل انجام دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بہت سے سرمایہ داروں کو دیکھتے ہیں جو شہروں سے دور بڑی بڑی زمینیں خریدتے ہیں۔ یہ زمینیں ایسی دور دراز ہوتی ہیں کہ اگر کسی دوسرے انسان کو اس قیمت پر یا اس سے بھی کم قیمت پر یہ زمین پیش کی جائے تو وہ ہرگز اسے خریدنے پر تیار نہ ہو۔ جب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر ان لوگوں نے کیوں یہ زمینیں خریدی ہیں تو پتا چلتا ہے کہ دراصل سرمایہ دار نے اپنی دور رس نگاہ کی بنا پر اس زمین کو خریدا ہے' وہ اپنے فہم و بصیرت کی بنا پر جانتا ہے کہ آئندہ پانچ برس بعد اس زمین کی قیمت کیا ہو گی اور اسے اس سے کتنا نفع حاصل ہو گا۔ یہی وجہ ہے جس نے اسے یہ زمین خریدنے پر آمادہ کیا ہے۔ جبکہ دوسرا فرد جو اس زمین کو خریدنے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں' اسکی وجہ اسکا مستقبل میں اس زمین کی اہمیت سے ناواقف ہونا ہے۔ اور یہی سوج بوجھ اور ناواقفیت ان دونوں قسم کے لوگوں کے عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

بنا برایں جہاد زندگی میں انسان کی طرف سے خطرناک ترین عمل اور تصور ہے اور

ایک ایسی معین اور مشخص فکر کی ضرورت ہے جو انسان کو اس بلند فریضے کی ادائیگی پر آمادہ کرے۔

صدرِ اسلام میں مسلمان اس قسم کی فکر اور جذبات کے مالک تھے ' لہٰذا جہاد کی طرف شوق اور اشتیاق کے ساتھ بڑھتے تھے لیکن عصر حاضر کے مسلمان نہ صرف اس قسم کی فکر اور جذبے کے مالک نہیں ' بلکہ جہاد کے حوالے سے ایک قسم کے منفی تصور اور روحِ جہاد کے منافی جذبات میں گرفتار ہیں۔ اور ان نکات اور منفی تصورات نے مسلمانوں اور جہاد کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔

اسلام اس فکر کے ذریعے بری اقدار کے خلاف جنگ ' اور انسان کے اندر پائے جانے والے منفی نقاط اور تصورات کو مسترد کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ اور انسانی روح میں اسلامی اقدار جیسے جہاد اور راہِ حق میں جد و جہد کے بیج اور پودوں کی کاشت کو لازم سمجھتا ہے اور اس عمل کو "جہادِ اکبر" کا نام دیتا ہے۔ وہی جہاد جو انسان کو ضرورت پڑنے پر ایثار و فداکاری کے لئے چوکس اور تیار حالت میں رکھتا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے مجاہدینِ اسلام کے ایک گروہ کو کفار کے خلاف جنگ کے لئے روانہ کیا ' جب یہ گروہ میدانِ جنگ سے واپس پلٹا تو آپؐ نے فرمایا :

"مرحبا بقوم قضوا الجهاد الاصغر و بقی علیهم الجهاد الاكبر"

"مرحبا ' اے گروہ مجاہدین (اے وہ لوگو) جنہوں نے چھوٹے جہاد کو انجام دیا ہے اور اب ان کے لئے جہادِ اکبر باقی ہے۔"

کہا گیا : اے اللہ کے رسولؐ! جہادِ اکبر کیا ہے؟

فرمایا :

"ان افضل الجهاد من جاهد نفسه التی بین جنبیه"

"افضل ترین جہاد ' اپنے نفس کے خلاف جہاد ہے جو انسان کے دو پہلوؤں

کے درمیان واقع ہے۔" (وسائل - ج ۱۱ - ص ۱۲۴)

اسی طرح امیر المومنینؑ نے اس موضوع کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے :

"میدانکم الاول انفسکم فان قدر تم علیها کنتم علی غیر ها اقدر وان عجزتم عنها کنتم عن غیر ها اعجز فجربوا معها الکفاح اولا"

"مقابلے کا اولین میدان خود تمہارا نفس ہے، پس اگر تم نے اس پر غلبہ پا لیا، تو اسکے علاوہ پر بھی غلبہ پا لو گے، اور اگر اسکے مقابلے میں ناتواں اور عاجز رہے تو اسکے علاوہ کے مقابل بھی ناتواں اور عاجز رہو گے۔ پس سب سے پہلے اس سے مقابلے میں اپنے آپ کو آزماؤ۔"

بری اقدار

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے نفس میں کن کن بری اقدار نے گھر کیا ہوا ہے جو اسے جہاد سے روکتی ہیں اور وہ کیا پست تصورات ہیں جو انسان کی فکر اور اسکے ذہن میں بیٹھ گئے ہیں اور جہاد کے لئے اسکے اٹھنے اور اسکے اسکی طرف جانے میں رکاوٹ ہیں اور اسے جہاد کی فضیلت کے حصول سے محروم رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھیں گے کہ اسلام اس مشکل کا علاج کس طرح کرتا ہے اور ان بری اقدار اور پست تصورات کو ہدف اور مقصد قرار دینے کی مزاحمت کیسے کرتا ہے۔ اور اس کے قائم مقام اور نعم البدل کے طور پر اسلامی تصورات کو انسان کے نفس میں کیسے پہنچاتا ہے۔

اختصار کے ساتھ ان سوالات کے جوابات درج ذیل صورت میں دیئے جاسکتے ہیں۔

۱ : دنیوی زندگی اور آرام طلبی سے لگاؤ

سامنے کی بات ہے کہ ہر انسان میں زندگی اور دنیا سے محبت پائی جاتی ہے اور وہ دنیوی آسائش و آرام کے حصول اور ان کی حفاظت کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ جبکہ جہاد

انسان سے راحت و آرام سلب کر لیتا ہے اور سے دنیوی حیات سے محرومی کے خطرے سے دوچار کر دیتا ہے۔

اس مقام پر انسانی نفس اور فریضہ ء جہاد کی ادائیگی کی روح کے مابین جنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ انسانی نفس کا میلان دنیوی زندگی اور راحت طلبی کی جانب ہوتا ہے جبکہ روحِ جہاد انسان کو ایثار و فداکاری کی دعوت دیتی ہے۔ اگر انسان گہرے ایمان کا مالک ہو، جو اسلام کی پرنور تعلیمات سے سیراب ہوتا ہے، تو اپنی بری خصلتوں پر غلبہ پا لیتا ہے اور فداکاری اور جہاد کی راہ اپناتا ہے۔ بصورتِ دیگر اپنے نفس کی برائیوں اور نقائص سے محفوظ نہیں رہ پاتا اور ان کا شکار ہو جاتا ہے۔

دینِ اسلام اس مشکل کی اصلاح اور علاج کے لئے انسانوں سے نہایت صریح الفاظ میں سخت اور حقیقی منطق کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے۔ کہتا ہے : اے انسان! تو جو موت کے خوف یا راحت طلبی اور دنیا دوستی کی بنا پر جہاد سے روگرداں ہے، کیا تو اس راحت و چین اور اس زندگی کے دوام و بقا کی ضمانت دے سکتا ہے؟ کیا تو ایسی کسی بیماری کا شکار نہیں ہو سکتا جو تجھ سے تیرا سکھ اور چین چھین لے، یا کوئی ایسا حادثہ تجھے پیش نہیں آ سکتا جو تجھے زندگی سے محروم کر دے؟ کیا تو ملک الموت سے امان میں ہے؟۔۔۔ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہو، اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو کیوں اس گرانقدر موقع کو ہاتھ سے کھو رہا ہے اور ایک ایسی موت کو اپنے لئے پسند کرتا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور اسکے عوض تجھے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا، جبکہ (راہ خدا میں) اپنی جاں نثار کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسکے عوض عزت و کرامت اور بے حساب جزا و ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری طرف کیا تو جہانِ آخرت، بہشت اور دوزخ پر ایمان نہیں رکھتا۔ پس کیوں روگرداں ہے اور میدانِ جہاد کی جانب قدم نہ اٹھا کے اپنے آپ کو آتشِ جہنم کے خطرے اور جنت کے خسارے سے دوچار کر رہا ہے اور وہ بھی صرف چند دن مزید زندہ رہنے کے لئے، یا دنیا کی پر مشقت زندگی کے مزید چند برسوں کے لئے؟

خداوندِ متعال فرماتا ہے :

"یا ایھا الذین آمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاخرۃ فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل ○ الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم"

"اے اہلِ ایمان! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا گیا کہ راہِ خدا میں جہاد کے لئے نکلو تو تم زمین سے چپک کے رہ گئے (تمہارے قدم نہ اٹھے اور تم سستی کے مرتکب ہوئے) کیا تم آخرت کے بدلے، دنیوی زندگی کو پسند کر بیٹھے ہو۔ (اگر ایسا ہے) تو یاد رکھو کہ آخرت میں اس دنیوی زندگی کے سرمائے کی حقیقت بہت قلیل ہے۔ اگر تم راہِ خدا میں نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو لے آئے گا۔" (سورہ توبہ ۹۔ آیت ۳۸، ۳۹)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

"ان الموت طالب حثیث لا یفوتہ المقیم، ولا یعجزہ الھارب، ان اکرم الموت القتل! والذی نفس ابن ابی طالب بیدہ، لالف ضربۃ بالسیف اھون علی من میتۃ علی الفراش فی غیر طاعۃ اللہ۔" (نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۲۱)

"موت تیزی کے ساتھ تمہاری طرف بڑھ رہی ہے، کوئی بھی اس کی گرفت سے نہ بچ سکے گا، نہ وہ لوگ جو (اس کے مقابل) کھڑے ہوئے ہیں اور نہ وہ جو اس سے راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ بہترین موت (راہِ خدا میں) قتل ہونا ہے۔ اس (خدا) کی قسم جس کے دست (قدرت) میں ابوطالب کے بیٹے کی جان ہے۔ پروردگارِ عالم کی طاعت کے بغیر بسترِ مرگ پر جان دینے سے مجھ پر تلوار کی ہزار ہا ضربیں آسان ہیں۔"

ایک دوسرے خطبے میں فرماتے ہیں :

"وایم اللہ لئن فررتم من سیف العاجلۃ" لا تسلموا من سیف الاخرۃ --- ان فی الفرار موجدۃ اللہ والذل اللازم، والعار الباقی، وان الفار لغیر مزید فی عمرہ، ولا محجوز بینہ وبین یومہ"

"خدا کی قسم اگر دنیا کی تلوار سے راہِ فرار اختیار کرو گے تو آخرت کی تلوار سے نہیں بچ سکو گے--- فرار میں خدا کا غضب ہے اور ہمیشہ کی ذلت اور ننگ، راہِ فرار اختیار کرنے والا اپنی عمر میں اضافہ نہیں کرتا اور اپنے اور اپنی موت کے دن کے درمیان کوئی رکاوٹ ایجاد نہیں کرتا۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۲)

امام حسینؑ نے فرمایا :

"وان تکن الابدان للموت انشئت فقتل امرء فی اللہ اولی وافضل"

"جب یہ بات طے شدہ ہے کہ ان جسموں کا انجام موت ہے تو پس خدا کی راہ میں مارے جانا اولیٰ اور افضل ہے۔"

۲ : دین اور زندگی کے بارے میں ایک فکری مغالطہ

اکثر لوگ حیات اور زندگی کے بارے میں صحیح طرزِ فکر کے مالک نہیں ہوتے اور زندگی کو خورد و خواب اور لذت و آسائش کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کے نزدیک ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے لئے ان اشیاء کو فراہم کرے، لیکن یہی لوگ اپنی عزت و شرافت کے لئے معمولی قیمت ادا کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے اور اس مہم کو ضروری اور لازم نہیں سمجھتے اور صرف کھانے پینے اور لذت و آسائش کو اپنا بہترین سرمایہ قرار دیئے

ہوئے ہیں۔

لیکن ایک مومن اور بیدار ضمیر انسان جانتا ہے کہ زندگی کو عزت و سربلندی کے ساتھ بسر کرنا چاہئے' اگر اس میں یہ فضیلت نہ پائی جائے تو ایسی زندگی کی کوئی قدر و قیمت اور حیثیت نہیں اور ایسی صورت میں انسان ذلت و پستی اور غلامی کے جوہڑ میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔

اس بارے میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

"فالموت فی حیاتکم مقھورین' والحیاۃ فی موتکم قاھرین"

"تمہارا ان سے دب کے رہنا جیتے جی موت ہے اور (ان پر) غالب آ کے مرنا جینے کے برابر ہے۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۵۱)

اور آپؑ کے فرزند امام حسینؑ نے بھی فرمایا ہے :

"انی لا اری الموت الا سعادۃ' والحیاۃ مع الظالمین الا برما"

"بے شک میں موت کو صرف سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ اور ان کے غلبے میں زندگی کو ذلت و خواری شمار کرتا ہوں۔"

کچھ دوسرے لوگ اسلامی جہاد کے بارے میں فکری مغالطے کا شکار ہیں اور غلط فہمی سے دوچار ہیں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں : جہاد کے لئے شرائط پوری نہیں۔ کیونکہ معصوم امامؑ موجود نہیں' جو جہاد کا حکم دے۔ اور دوسرے یہ کہ معصوم امامؑ کی نیابت میں کوئی مجتہد نہیں جو جہاد کی دعوت دے اور اسکی قیادت کرے۔ یہ طرز فکر نرا مغالطہ ہے' اور ایک ایسا شخص جو اسلام میں جہاد کی فقہ سے معمولی سی بھی واقفیت رکھتا ہو' وہ اس مغالطے کو پہچان سکتا ہے اور اسے مسترد کر سکتا ہے۔

فقہائے عظام کی نظر میں جہاد کی دو قسمیں ہیں۔

الف - جہاد بصورتِ حملہ : جو دوسرے معاشرے میں اسلام کی نشر و اشاعت اور

روئے زمین پر نامِ خدا کو بلند کرنے کی غرض سے ہو۔ اس میں امامِ معصومؑ کی قیادت اور اجازت شرط ہے۔

یہ جہاد واجبِ کفائی ہے اور اگر امتِ اسلامی کے کچھ لوگ اس کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو دوسروں کے ذمے سے اسکا وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں حضرت علیؑ کا ارشاد ہے :

"لایخرج المسلم فی الجهاد مع من لایومن علی الحکم ولا ینفذ فی الفیء امر اللہ عزوجل"

"مردِ مسلمان کسی ایسے شخص کے ہمراہ جہاد کے لئے نہیں نکلتا جو حکمِ خدا پر ایمان نہیں رکھتا اور مال غنیمت کی تقسیم میں خداوند عالم کے حکم کا اجراء نہیں کرتا۔" (وسائل الشیعہ ۔ ج ۱۱ ۔ ص ۳۴)

ب ۔ دفاعی جہاد : دین اور مملکت' اپنے ذاتی یا ملی حقوق اور مال اور عزت و آبرو کا دفاع اور محرومین اور کمزور بنا دیئے گئے لوگوں کی حمایت کے لئے جہاد۔

اس قسم کی جنگ اور محاذ آرائی نہ صرف جائز ہے بلکہ ہر فردِ مسلم پر واجب ہے اور اس میں امام یا مرجع کی اجازت کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی مجاہد ان میں سے کسی مقصد کی راہ میں مارا جائے تو خدا کے نزدیک شہید ہے۔

اس بارے میں رسولِ گرامیؐ اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ نے فرمایا ہے :

"من قتل دون عیالہ فھو شھید' ومن قتل دون مظلمة فھو شھید' ومن قتل دون مالہ فھو شھید"

"اگر کوئی اپنے گھرانے کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے' تو وہ شہید ہے۔
اور جو کوئی اپنے حقوق کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے' تو وہ شہید ہے۔
اور جو کوئی اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے' تو وہ شہید ہے۔"

(وسائل ۔ ج ۱۱ ۔ ص ۹۲' ۹۳)

نہج البلاغہ میں ایک مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ

معاویہ کے لشکر کے حملے کے موقع پر مزاحمت اور مقابلہ نہ کرنے پر ایک گروہ کو لعنت ملامت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"ثم انصر فوا وافرین ما نال رجلا منهم کلم ولا اریق لهم دم"

"وہ کثیر مالِ غنیمت لے کر پلٹ گئے' بغیر اسکے کہ ان کا ایک بھی فرد زخمی ہوا ہو یا ان کے خون کا ایک بھی قطرہ بہا ہو۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۷)

نیز اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں :

"فقبحا لکم وترحا حین صرتم غرضا یرمی یغار علیکم ولا تغیرون وتغزون ولا تغزون"

"تمہارا برا ہو اور تم غم و اندوہ میں مبتلا رہو۔ تم تو از خود تیروں کا نشانہ بنے ہوئے ہو' تمہیں ہلاک اور تاراج کیا جا رہا ہے' مگر تمہارے قدم حملے کے لئے نہیں اٹھتے' وہ تم سے لڑ بھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۷)

استاد العلما صاحبِ الجواہر فرماتے ہیں :

"اگر کافر دشمن مسلمانوں پر حملہ آور ہوں اور اس بات کا خدشہ پیدا ہو جائے کہ اسلام کی اصل و اساس خطرے میں پڑ جائے گی' یا یہ کہ وہ لوگ اسلامی سرزمینوں پر قبضہ کر لیں گے' یا مسلمانوں کے مال و دولت کو غارت کر دیں گے' تو تمام مسلمان مرد و زن' بندہ و آزاد' بیمار و غیر بیمار' حتیٰ ناقص الاعضا افراد' مختصر یہ کہ ایک ایک مسلمان پر دفاع واجب ہو جاتا ہے۔ اور دفاع کے واجب ہونے کے لئے معصوم امامؑ کی موجودگی اور اس کی اجازت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور یہ (حکم) صرف ان لوگوں کے لئے مختص نہیں ہے جن پر حملہ ہوا ہے' بلکہ ان تمام لوگوں پر واجب ہے جن کی اطلاع میں یہ صورتحال آئے' اگرچہ دشمن نے ان

سے تعرض نہ کیا ہو۔ اور یہ اس صورت میں ہے جب ایسے لوگ جو دشمن کے تعرض کا نشانہ بنے ہیں انہیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ وہ دشمن سے دفاع اور اسکے حملے کا مقابلے کرنے کی توانائی رکھتے ہیں یا نہیں۔

۳ : عذر بدتر از گناہ

ایسے لوگ بھی ہیں جو جنگ اور جہاد کے ضروری ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دیتے ہوئے اپنے جمود اور کاہلی کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جو عذر بدتر از گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔ کبھی تعلیم کے جاری رکھنے اور تجارتی یا پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو بطورِ عذر پیش کرتے ہیں اور کبھی بیوی بچوں کی نگہداشت کو بہانہ بناتے ہیں اور کبھی حالاتِ زمانہ اور اپنی بری مالی حالت کو ملامت کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان تمام بہانوں اور عذر تراشیوں کی سختی کے ساتھ مذمت اور انہیں مسترد کرتا ہے اور ایسی سوچ کے مالک لوگوں کو برے انجام کی خبر دیتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے :

"قل ان کان آباو کم و ابناوکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتمو ھا و تجارۃ تخشون کساد ھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ و جھاد فی سبیلہ فتر بصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین"

(سورہ توبہ ۹ - آیت ۲۴)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ دادا، اولاد، برادران، ازواج، عشیرہ و قبیلہ اور وہ اموال جنہیں تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے خسارے کی طرف سے فکر مند رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں پسند کرتے ہو تمہاری نگاہ میں اللہ، اسکے رسول اور راہِ خدا میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو وقت کا انتظار کرو یہاں تک کہ امرِ الٰہی (خدا کا

عذاب) آجائے۔ اور اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔"

اور جب حضرت علیؑ کو اپنے اصحاب کے ایک گروہ کی طرف سے مشکل کا سامنا کرنا پڑا' وہ جہاد سے کوتاہی کرتے تھے اور اسکی ذمے داری اٹھانے پر تیار نہ تھے اور اپنے اس عمل کی توجیہ میں حالات و شرائط کی تبدیلی کو پیش کرتے تھے۔ تو آپؑ نے ان لوگوں سے ایک ولولہ انگیز خطاب فرمایا' جس کا ایک حصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے :

"فاذا امرتكم بالسير اليهم فى ايام الحر قلتم هذه حمارة القيظ امهلنا يسبخ عناد الحر! واذا امرتكم بالسير اليهم فى الشتاء قلتم هذه صبارة القر امهلنا ينسلخ عنا البرد كل هذا فرارا من الحر والقر!! فاذا كنتم من الحر والقر تفرون فانتم والله من السيف افر! يا اشباه الرجال ولا رجال! حلوم الاطفال وعقول ربات الحجال لوددت انى لم اركم ولم اعرفكم"

"اگر گرمیوں میں تمہیں ان کی طرف بڑھنے کے لئے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ یہ انتہائی شدت کی گرمی کا زمانہ ہے' اتنی مہلت دیجئے کہ گرمی کا زور ٹوٹ جائے۔ اور اگر سردیوں میں چلنے کے لئے کہتا ہوں تو تم یہ کہتے ہو کہ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے' اتنا ٹھہر جایئے کہ سردی کا موسم گزر جائے۔ یہ سب سردی اور گرمی سے بچنے کے بہانے ہیں۔ جب تم سردی اور گرمی سے اس طرح (وحشت زدہ ہو کے) بھاگتے ہو تو پھر خدا کی قسم تم تلواروں کو دیکھ کر اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔ اے مردوں کی شکل و صورت والے نامردو' اے کم عقل بچوں کی صفت رکھنے والو' اے حجلہ نشین عورتوں کی مانند (لوگو)' مجھے کتنا پسند ہے کہ نہ تم کو دیکھتا اور نہ تم سے جان پہچان ہوتی۔" (نہج البلاغہ - خطبہ ۲۷)

۴ : زبانی کلامی انقلابی بننا

بعض لوگوں کے نزدیک جہاد' بس جوش و خروش کی باتیں کرنے' انقلابی تحریروں اور تقریروں تک محدود ہے۔ لیکن جب کبھی ان سے ایثار و فداکاری کا تقاضا کیا جائے' یا جہادی اور مسلحانہ اقدام کی دعوت دی جائے تو فوراً کھسک لیتے ہیں اور مبارزے کے میدان میں قدم رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ اپنے بعض اصحاب سے جو ایسی ہی صفات کے مالک تھے' فرماتے ہیں :

"ایھاالناس المجتمعة ابدانھم المختلفة اھواوھم' کلا مکم یوھی الصم الصلاب و فعلکم یطمع فیکم الاعداء اتقولون فی المجالس کیت وکیت' فاذا جاء القتال قلتم : حیدی حیاد"

"اے وہ لوگو! جن کے جسم یکجا اور خواہشات جدا جدا ہیں۔ تمہارے زبانی دعوے تو سخت پتھروں کو بھی توڑ کے رکھ دیتے ہیں لیکن تمہارا عمل ایسا ہے جو دشمنوں کو تم پر دندانِ آز تیز کرنے کا موقع دیتا ہے۔ اپنی مجلسوں میں تو تم کہتے پھرتے ہو کہ یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے لیکن جب جنگ چھڑتی ہے تو تم اس سے پناہ مانگنے لگتے ہو۔" (نہج البلاغہ ۔ خطبہ ۲۹)

کس ذریعے سے اور کس مقصد کے لئے جہاد کیا جائے

استعمار و استکبار' ظلم و ستم اور انحراف و بگاڑ کے خلاف اقدام کے لئے اسلام کو طرح طرح کے اسلحوں اور قوتوں کی ضرورت ہے۔ پروپیگنڈہ بھی ایک قسم کا اسلحہ ہے' تحریر و تقریر بھی اسلحہ کی ایک قسم ہے' پیسہ اور مادی امکانات بھی اسلحہ ہیں' سیاسی اور اجتماعی سرگرمیاں بھی اسلحہ ہیں۔۔۔ جنگ و جہاد کے مختلف مراحل میں ان تمام ہی اسلحوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم حضرت خدیجہؓ کے

مال و دولت اور حضرت علیؑ کی تلوار کو اسلام کی نصرت اور فتح مندی کے دو بنیادی اسباب قرار دیتے تھے۔

قرآن کریم بھی بار بار جان و مال سے جہاد کی تاکید کرتا ہے۔ حضرت علیؑ کا فرمان بھی ہے:

اللہ اللہ فی الجہاد باموالکم وانفسکم والسنتکم"

"جان، مال اور زبان سے راہِ خدا میں جہاد کرنے کے بارے میں اللہ کو نہ بھولنا۔" (نہج البلاغہ ۔ مکتوب ۴۷)

اسلام کی نظر میں جہاد کے مقاصد کو مختصر طور پر درج ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱ ۔ کفر و استکبار کی حکومتوں سے انسانیت کو نجات دلانے کی غرض سے "گوشہ و کنارِ عالم میں اسلام کا پیغام پہنچانے اور اسکی تبلیغ و تشہیر کے لئے جہاد۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین کله لله"

"اور تم لوگ ان کفار سے جہاد کرو، یہاں تک کہ فتنے کا وجود نہ رہے اور سارا دین صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔"

(سورہ انفال ۸ ۔ آیت ۳۹)

۲ ۔ دین، وطن اور جانوں اور حقوق کے تحفظ کے لئے جہاد۔

پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے:

"من قتل دون مظلمة فهو شهید"

"جو کوئی اپنے حقوق کی حفاظت کے دوران مارا جائے، وہ شہید ہے۔"

۳ ۔ امت کی اصلاح کے لئے جہاد۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"ان اقاتل علی التنزیل وعلی یقاتل علی التاویل"

"ان سے میری جنگ نزولِ قرآن کے بارے میں ہے، اور علی تاویلِ

قرآن کے بارے میں ان سے برسرپیکار ہوں گے۔"

(بحار الانوار۔ج ۳۲۔ص ۲۹۹)

۴ ۔ مظلوموں اور لاچاروں کی نجات کے لئے جہاد۔

خداوند عالم فرماتا ہے :

"ومالکم لاتقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا"

"اور آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لاچار مردوں' عورتوں اور بچوں کے لئے جہاد نہیں کرتے ہو جنہیں کمزور بنا کر رکھا گیا ہے اور جو برابر دعا کرتے ہیں کہ بارِالٰہا! ہمیں اس قریہ سے نجات دلا دے جس کے باشندے ظالم ہیں۔" (سورہ نساء ۴۔ آیت ۷۵)

حضرت علیؑ نے فرمایا ہے :

"فواللہ لولم یصیبوا من المسلمین الا رجلا واحدا معتمدین لقتلہ بلا جرم جرہ' لحل لی قتل ذلک الجیش کلہ"

"خدا کی قسم' اگر مجھے صرف ایک آدمی بھی ملتا جسے جانتے بوجھتے بے گناہ قتل کرتے' تو ان سب کا قتل مجھ پر حلال ہو جاتا۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۰)

یادداشت

ہماری مطبوعات

دنیائے جوان

تالیف : آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ (لبنان)

نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں

تالیف : رضا فرہادیان

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدو جہد

تالیف : آیت اللہ سید علی خامنہ ای

امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟

مولفین : علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری

علمائے دین اور عمائدین ملت سے

حسین ابن علیؑ کا خطاب

(امام حسینؑ کا معروف خطبہ ء منیٰ اور اس کی تشریح و توضیح)

تالیف : حجت الاسلام محمد صادق نجمی

دار الثقلین